# ابتدا تیرے نام سے

قارئینِ کرام!

ملک بھر میں سیاسی اور مذہبی اجتماعات اور جلسے جلوسوں کی گہما گہمی ہے۔تحریکِ انصاف اور عوامی تحریک کے دھرنوں کے بعد مسلم لیگ ن بھی جواب آں غزل کے لیے میدان میں کود پڑی۔اسی دوران تبلیغی جماعت کا سالانہ اجتماع شروع ہو گیا اور دو قسطوں میں اختتام پذیر ہوُا۔پھر جماعتِ اسلامی کا ملک گیر اجتماعِ عام ہوُا۔اب جماعت الدعوہ کے اجتماع کا آغاز ہے۔اللہ کرے امن و امان کی فضا برقرار رہے اور یہ سرگرمیاں ملک و قوم کے لیے خیر و عافیت پر مبنی رہیں۔

جماعت اسلامی کا اجتماع چھ سال بعد منعقد ہوُا۔ بلکہ اگر اجتماعِ عام کے لحاظ سے دیکھا جائے تو دس سال بعد ہوُا۔اس بار اجتماع میں شریک لوگوں کی تعداد خود منتظمین کے اندازوں سے کہیں زیادہ تھی،جس پر بہت سے تبصرے کیے گئے ہیں۔ان دس برسوں میں افرادی قوت کے لحاظ سے بھی اس جماعت نے ترقی کی ہے۔مگر اکثر تجزیوں میں نئے منتخب امیر سراج الحق کو جماعت کی عوامی پذیرائی کی وجہ سمجھا جا رہا ہے۔پاکستان کے سیاسی منظرنامے میں جماعتِ اسلامی کئی لحاظ سے ممتاز اور یکتا ہے۔اس کا پہلا امتیاز تو یہ ہے کہ یہ ایک نظریاتی جماعت ہے اور اپنے نظریے کے مطابق دین اور سیاست میں دوئی کی قائل نہیں بلکہ ریاست کی قوتِ نافذہ کو دین کے قیام کے لیے لازمی سمجھتی ہے۔اس اعتبار سے یہ حکومت کے حصول کی جدو جہد کو اپنا دینی فرض سمجھتی ہے۔دوسرا یہ کہ اس جدو جہد کے لیے سو فیصد آئینی اور دستوری راستے اختیار کرنے پر یقین رکھتی ہے۔تیسرا یہ کہ اپنے سیاسی،فلاحی دعوتی اور تربیتی مقاصد کے حصول کے لیے یہ ایک مضبوط تنظیم کی شکل میں کام کرتی ہے۔چوتھا، یہ کارکنان کی بھیڑ اکٹھی کرنے کی بجائے فرد کی کردار سازی کا ٹھوس پروگرام رکھتی ہے یعنی تعداد کی بجائے معیار پر بھروسہ کرتی ہے۔اس کا پانچواں امتیاز یہ ہے کہ یہ محض جمہوریت کے دعووں کے بل پر سیاست نہیں کرتی بلکہ حقیقی جمہوریت پر عمل پیرا ہے۔اس میں قیادت کے لیے چھینا جھپٹی تو کیا خواہش رکھنا بھی قیادت کے لیے نااہل بنا دیتا ہے اور خالص جمہوری اور دستوری انداز میں اعلیٰ قیادت منتخب ہوتی ہے۔اس کے قائدین عام کارکنان کی طرح رہتے ہیں۔پاکستانی کلچر کو دیکھتے ہوئے اس کا ایک اور بڑا امتیاز بلکہ اعزاز یہ ہے کہ اس کے ارکان جب بھی حکومتوں میں شریک رہے، کرپشن اور خیانت سے لتھڑے ہوئے ماحول میں ہمیشہ دامن بچا کر نکلے اور ملکی وسائل یا عوامی فنڈز کی لوٹ کھسوٹ کے بازار میں ان کا دامن کسی بھی الزام سے پاک رہا۔اس جماعت کے جاں نثار کارکن ہر صوبے اور برادری میں موجود ہیں اور علاقائی یا نسلی وابستگی سے بالاتر ہو کر پاکستانیت پر یقین رکھتے ہیں، گویا یہ صحیح معنوں میں قومی یک جہتی کی علامت ہے بلکہ دنیا بھر کی اسلامی تحریکوں سے مضبوط روابط کی بنا پر ملّی اتحاد کی علمبردار ہے۔ملک پر آنے والی ہر آفت میں یہ پاک فوج کے شانہ بشانہ ہر قسم کی جانی و مالی قربانیوں کے لیے مستعد نظر آتی ہے۔عوامی خدمت کے لیے اس کے ملک گیر پراجیکٹ ہر علاقے اور ہر شعبہِ زندگی میں موجود ہیں۔

خواتین کی ایک بڑی تعداد اس جماعت سے وابستہ ہے۔بانیِ جماعت مولانا مودودی نے اپنی ابتدائی تقاریر میں یہ بات واضح کر دی تھی کہ اسلام میں عورتیں مردوں کا ضمیمہ نہیں ہیں، انہیں خدا کے آگے اپنی زندگی کا خود حساب دینا ہوگا، لہٰذا وہ اپنے دین کی بھی خود ذمہ دار ہیں۔اسی بنیادی سوچ کے مطابق جماعت کا حلقہ خواتین اپنے متوازی نظم کے تحت معاشرے کی تعمیر میں نہایت فعال کردار ادا کر رہا ہے اور خواتین اپنی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کر رہی ہیں۔

حالیہ اجتماع اگرچہ شرکا کی غیر معمولی آمد کے باعث منتظمین کے لیے ایک بڑا چیلنج رہا مگر دیکھنے والوں کے لیے یہ جماعتِ اسلامی کے روایتی ڈسپلن اور کلچر کا آئینہ دار تھا۔ یہاں دوسری کئی سیاسی و مذہبی جماعتوں کے برعکس لوگ پیسے ملنے کی امید پر نہیں بلکہ پیسے خرچ کر کے آئے تھے۔ ارکان نے ذاتی اجتماع فنڈ بھی دیا، اپنا سفر خرچ بھی اٹھایا اور یہاں تین دن کے کھانے کی ادائیگی بھی کی۔ عالم اسلام سے معروف مہمانوں کی شرکت حسبِ روایت تھی مگر غیر مسلموں کی شرکت اس اجتماع کی خاص بات رہی۔

اس اجتماع کے بعد جماعتِ اسلامی پاکستان کے کردار اور سیاست پر بہت کچھ کہا اور لکھا گیا ہے۔ جہاں پاکستان کی نظریاتی وجغرافیائی سرحدوں کے تحفظ میں جماعت کے کردار کو سراہا گیا اور اس کی قیادت، جمہوری نظام اور بلند کردار کا اعتراف ہوا، وہیں اس کی انتخابی کارکردگی بھی زیرِ بحث آئی اور اس کے لیے بہت سے مفید مشورے بھی سامنے آئے۔ پاکستان اس وقت قیادت کے جس بحران سے دوچار ہے، اگر جماعتِ اسلامی جیسی مخلص، منظّم اور باکردار قوت ملک کی باگ ڈور سنبھالنے کے لیے عوام کا اعتماد حاصل کر سکے تو یقیناً پاکستان میں حقیقی تبدیلی آسکتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ جماعت عوام الناس کے ساتھ ان کی سطح پر آکر اپنے لیے قبولیت پیدا کرے، ان کے خدشات کو دور کرے اور خود کو بہترین انتخاب کے طور پر پیش کرے۔ میڈیا کا بھی فرض ہے کہ غیر جانبدار رہ کر عوام کے سامنے حقائق پر مبنی رپورٹنگ کرے۔

امریکی ریاست میسوری کے شہر فرگوسن میں پیش آنے والا واقعہ امریکہ میں عوامی احتجاج کا باعث بنا ہوا ہے۔ اٹھارہ سالہ مائیکل براؤن کو ایک پولیس افسر نے فائر کر کے مار ڈالا مگر عدالت نے افسر پر فردِ جرم عائد نہیں کی۔ اس واقعے کو کالے اور رنگدار لوگوں کے لیے امریکی ریاست کے امتیازی رویوں اور پالیسیوں کے تناظر میں دیکھا جا رہا ہے۔ امریکہ کو ساری دنیا کا تھانیدار بننے کی بجائے اپنے گھر کو درست کرنے کی ضرورت ہے۔ امریکہ میں نسلی امتیاز خصوصاً کالوں کے خلاف تعصب آج بھی وہاں کا ایک بڑا المیہ ہے جو صرف معاشرتی رویوں کی سطح پر نہیں بلکہ ان کے پیچھے ریاستی اداروں کا کردار بھی ہے، اور دراصل تبھی ایسے رویے معاشروں میں پنپتے ہیں جب ان کی پشت پناہی قانون اور قوت سے کی جا رہی ہو۔ نو گیارہ کے بعد سے امریکہ بھر میں مسلمانوں کو بھی جس تعصب اور تشدد بھرے رویوں کا سامنا ہے ان کے پیچھے بھی امریکہ کی عالمی پالیسیاں اور ریاست کے داخلی رویے ہیں۔

دوسری طرف ہمارے ہاں کوٹ رادھا کشن کے افسوس ناک واقعے کے بعد میڈیا اور بیرونی فنڈز پر چلنے والی این جی اوز نے ناموسِ رسالت کے قانون کے خلاف طوفان اٹھا دیا۔ اس واقعے کی تمام دینی و سماجی حلقوں کی جانب سے شدید مذمت کی گئی اور مظلومین کے ساتھ اظہارِ یکجہتی کرتے ہوئے فوری انصاف کا مطالبہ کیا گیا مگر ابھی تک مجرموں کو سزائیں نہیں سنائی گئیں۔ فرق یہ ہے کہ وہاں قانون اور عدالتیں ظلم کی سرپرستی کرتی ہیں تو ہمارے ہاں قانون اور عدالتوں کی گرفت نہ ہونے کے باعث ظلم ہوتا ہے۔ دونوں قسم کی صورتحال میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مگر قانون کی بالادستی کا تقاضا کرنے کی بجائے بیرونی اشاروں پر ہمارے معاملات کو اچھالا اور ملک کو بدنام کیا جاتا ہے۔ جبکہ مغربی ممالک اپنے دہرے معیارات کے باوجود انصاف کے علم بردار بنے رہتے ہیں۔ حال ہی میں ایک برطانوی نسل پرست دہشت گرد فوجی ''مک گی'' کو بم بنانے اور قابلِ اعتراض مواد رکھنے کے باوجود اس پر دہشت گردی کا مقدمہ قائم نہیں کیا گیا۔ جبکہ مسلمان نوجوانوں کو محض مسلمان ہونے کی بنا پر ہر جگہ تعصب اور شک کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

۲۰۱۴ کے آخری ماہ کے آغاز کے ساتھ اجازت دیجیے۔ بشرطِ زندگی نئے سال کی ملاقات تک!

دعا گو۔ صائمہ اسما

ڈاکٹر ممتاز عمر

# ماں کا دُودھ ایک عظیم نعمت

قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''مائیں اپنی اولاد کو دو سال کامل دودھ پلائیں۔''(۱)

''جن کے بچے ہیں ان کے ذمے ان کا روٹی کپڑا ہے جو مطابق دستور کے ہو، ہر شخص اتنی ہی تکلیف دیا جاتا ہے جتنی اس کی طاقت ہو۔ ماں کو اس کے بچے کی وجہ سے یا باپ کو اس کی اولاد کی وجہ سے کوئی ضرر نہ پہنچایا جائے۔ وارث پر بھی اسی جیسی ذمہ داری ہے''(۲)

پھر بھی اگر بیماری، تعلقات میں کشیدگی یا کسی اور وجہ سے ماں دُودھ پلانے سے قاصر ہو تو کوئی دوسری عورت بھی دودھ پلا سکتی ہے۔ اس کی اجازت بھی رب العالمین نے اس طرح عطا کی ہے۔ ''اور اگر تمہارا خیال اپنی اولاد کو کسی غیر عورت سے دُودھ پلوانے کا ہو تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں بشرطیکہ اس کا جو کچھ معاوضہ طے کرو وہ معروف طریقے پر ادا کرو۔''(۳)

ہمارے یہاں ان وجوہات کے بغیر بھی مائیں دُودھ پلانے سے خود کو مبرا سمجھتی ہیں، کبھی اس کی وجہ دُودھ کی کمی تو کبھی کوئی اور مفروضہ گھڑا جاتا ہے۔

ماں کے دُودھ کی اس قدر اہمیت کیوں ہے کہ قرآن کریم نے پورے دو سال تک دودھ پلانے کا حکم دیا۔ طلاق یا کسی دیگر وجہ کے باوجود کسی دوسری عورت کا دُودھ پلوانے کا طریقہ طے کیا گیا۔ اسلام دین فطرت ہے۔ اسی بنا پر بچے کے لیے ترجیحاً ماں ورنہ کسی دوسری عورت کا دُودھ پلانے کا بندوبست کیا گیا ہے کچھ عرصہ قبل مغرب میں ایک ایسی مہم چلائی گئی جس میں ان تمام جانوروں کو دکھایا گیا جو اپنے بچوں کو دُودھ پلا رہے تھے پھر یہ ترغیب دی گئی کہ جب جانور اپنے بچوں کو دُودھ پلاتے ہیں تو انسان کو ایسا کرنے میں کیا مضائقہ؟ اس مہم کی نوبت اس لیے آئی تھی کہ 'مغرب میں بالخصوص اور ہمارے یہاں بالعموم ماؤں نے بچوں کو دودھ پلانا اپنے لیے مشکل و پریشانی سمجھتے ہوئے ڈبے کا دودھ پلانے کو فوقیت دی۔

ذرا غور کریں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک قدرتی انتظام ماں کے ذریعے بچے کی غذا کا کیا ہے۔ اس کے کئی فائدے ہیں اول تو ماں کا دودھ بہت مہنگا نہیں ہوتا محض تھوڑی سی بہتر خوراک کی بناء پر ماں بچے کو دودھ پلاتی ہے اور اس کی اپنی صحت بھی متاثر نہیں ہوتی۔ جب کہ ڈبے کے دودھ پر نسبتاً خرچ زیادہ آتا ہے اور جوں جوں بچہ بڑا ہوتا ہے خرچ بھی اسی تیزی سے بڑھتا ہے۔ جب کہ ماں کا دُودھ خریدنا نہیں پڑتا با آسانی اور ہر وقت دستیاب ہوتا ہے۔ اسی طرح صاف ستھرا، حفظانِ صحت کے عین مطابق بیکٹیریا سے پاک ہوتا ہے اور بہت اچھے طریقے سے بچے تک پہنچتا ہے جب کہ بکری، گائے، بھینس یا ڈبے کا دُودھ بوتل کے ذریعے غیر محفوظ انداز میں بچے تک پہنچتا ہے۔ اسی طرح اوپر کا دُودھ کبھی زیادہ گرم یا ٹھنڈا ہو سکتا ہے جو بچے کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگا جب کہ ماں کا دودھ مناسب درجہ حرارت رکھتا ہے، جتنا دودھ کا درجہ حرارت مطلوب ہے اتنا ہی ہوتا ہے کم یا زیادہ نہیں ہوتا۔ پھر اس دودھ میں موجود اجزاء بچے کی نشو ونما میں بڑے مفید ہوتے ہیں اس میں موجود پروٹین آسانی سے ہضم ہو جاتے ہیں اور اس میں لیکٹوز کا درجہ بہت ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ ماں کا دُودھ صرف غذا یا پیٹ بھرنے کا سامان نہیں ہوتا بچے کے جذبات کی تسکین کا سبب بھی بنتا ہے۔ اس طرح ماں کا دُودھ بچے کو جذباتی تسکین دیتا ہے اور ایک بچے کی صحت کے لیے غذا اور جذباتی تسکین دونوں ہی ضروری ہیں۔

تحقیق سے یہ بھی ثابت ہوا کہ ماں کے دُودھ سے موروثی امراض اور انفیکشن کے خلاف قوتِ مدافعت پیدا ہوتی ہے اور آنتوں کی کئی بیماریوں سے بھی نجات ہوتی ہے، ماں کا دُودھ بچوں کو الرجی سے

بھی بچاتا ہے۔ پھر ماں کو بھی یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اس کے یوٹرس کو بڑھنے سے روکتا ہے اور اس کے جسم کو دوبارہ اپنی جگہ پر آنے میں مدد دیتا ہے۔ اکثر دُودھ پلانے کی وجہ سے قدرتی طور پر بچوں کے درمیان وقفہ ہو جاتا ہے اور فیملی پلاننگ کی ضرورت نہیں رہتی۔ دُودھ پلانے والی مائیں بہ نسبت دُودھ پلانے والی ماؤں کے بریسٹ کینسر سے زیادہ محفوظ رہتی ہیں۔

''کاؤنٹیا فلمپٹن کے ہیلتھ سروسز ڈیپارٹمنٹ کی تحقیق کے مطابق ماں کا دُودھ بچے کو کان اور سینے کے انفیکشن سے حفاظت فراہم کرتا ہے اور بچے میں ذیابیطس کی بیماری کا اندیشہ بھی کم ہو جاتا ہے اور ڈائیریا و پیٹ کی دیگر بیماریوں کے خلاف قوتِ مدافعت پیدا ہوتی ہے اور یہ با آسانی ہضم ہو جاتا ہے۔ پیدائش کے فوراً بعد جو دودھ آتا ہے اسے کروسٹم کہا جاتا ہے اس کی شکل بعد میں آنے والے دودھ سے کچھ مختلف ہوتی ہے۔ اس میں خاص طور پر غذائیت اور اینٹی باڈیز کی مقدار زیادہ ہوتی ہے جو بچے کو بہت سے انفیکشن سے بچاتے ہوئے ان میں قوتِ مدافعت پیدا کرتے ہیں۔ جو بچے ماں کے دودھ پر پلتے ہیں ان میں یوریزی ٹریکٹ انفیکشن بہت کم ہوتا ہے اور ان میں دمہ اور چائلڈ ہڈ کینسر کے امکانات بھی بہت کم ہوتے ہیں۔ سروے سے یہ بھی پتہ چلا کہ ماں کا دُودھ پینے والے بچے بہ نسبت ان بچوں کے جو ماں کا دُودھ نہیں پیتے ہسپتال میں کم تعداد میں لائے گئے۔'' (۴)

جو بچے ماں کا دُودھ پیتے ہیں ان کے دماغ کی نشوونما بہ نسبت دوسرے بچوں کے زیادہ بہتر ہوتی ہے کیونکہ انہیں دودھ پیتے وقت محنت کرنی پڑتی ہے جو ان کی حرکات وسکنات میں اضافے کا باعث ہوتی ہے اور بچوں کے گال اور زبان کے پٹھے پروان چڑھتے ہیں۔ ''ایک اور تحقیق میں پیدائش سے چھ سال تک کی عمر کے ایسے نوزائیدہ 9 ہزار بچوں کا مشاہدہ کیا گیا، ان میں سے وہ بچے جو ماں کے دُودھ پر پروان چڑھے ان میں زندگی بھر موٹاپے کے امکانات بہت کم پائے گئے کیونکہ انہیں چکنائی (Fats) اور دیگر اشیاء اتنی ہی ملیں جتنی ان کی جسمانی ضرورت تھی جب کہ دیگر بچے اوپر کا دُودھ پینے کی وجہ سے چکنائی اور دیگر اجزاء کی کمی یا زیادتی کا شکار رہے۔ اسی تحقیق میں یہ بات بھی سامنے آئی کہ وہ مائیں جو بچوں کو دُودھ پلا رہی تھیں ان میں ہڈیوں کے بھر بھرے پن کی بیماری کم سامنے آئی بہ نسبت دوسری ماؤں کے۔'' (۵) حالانکہ بچے کو دُودھ پلانے کی وجہ سے کیلشیم کی کمی کے امکانات بڑھتے ہیں مگر کیلشیم بننے کی صلاحیت بھی بڑھی ہو گی یوں کیلشیم کی کمی سامنے نہیں آئی۔

قرآن کریم کا حکم تو یہ ہے کہ بچوں کو دو سال تک ماں کا دودھ پلایا جائے اور یہ حکم قریباً سوا 14 سو سال پہلے کا ہے مگر جدید سائنس نے تجربات، مطالعات اور مشاہدات سے جو نتائج اخذ کیے ان میں چھ ماہ سے دو سال تک دودھ سے جو نتائج اخذ کیے ان میں وہ چھ ماہ سے دو سال تک دودھ پلانے کی افادیت کے قائل نظر آئے۔ یہ بات بھی اس قرآنی احکام کے مطابق ہے کیا دودھ پلانے کی مکمل عمر تو 2 سال ہے مگر اس سے پہلے بھی دودھ چھڑایا جا سکتا ہے۔ ''امریکن اکیڈمی آف پیڈیاٹرکس نے تحقیق سے یہ بات واضح کی کہ بچوں کو کم از کم ایک سال تک ماں کا دُودھ پلانا چاہیے اور اس کے بعد بھی پلا سکیں تو ضرور پلائیں۔ اسی طرح عالمی ادارہ صحت اور یونیسیف نے مل کر چند کانفرنسیں منعقد کیں اور ان میں یہ بات سامنے آئی کہ ماؤں کو یہ ترغیب دی جائے کہ وہ دو سال تک بچوں کو اپنا دُودھ پلائیں۔ اس موقع پر یہ بتایا گیا کہ پہلے سال تو بچے کے لیے ماں کا دُودھ لازمی ہے مگر دوسرے سال بھی غذائیت کی بناء پر بچے کی نشوونما کے لیے اس کی اہمیت مقدم ہے کیونکہ بچے کے لیے وٹامنز، کیلشیم اور پروٹین حاصل کرنے کے لیے ماں کا دُودھ سب سے بہترین ذریعہ ہے۔'' (٦)

پھر جوں جوں بچہ بڑا ہوتا ہے اس کی ضروریات کے مطابق غذائیت اور قوتِ مدافعت بھی توانا ہوتی ہے۔ ''یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ ماں کا دُودھ پینے والے بچوں کا آئی کیو لیول دوسرے بچوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوتا ہے کیونکہ وہ خود کو زیادہ محفوظ اور ماں کی محبت کے قریب محسوس کرتے ہیں اس لیے ان میں اعتماد پروان چڑھتا ہے، ایسے بچے خود اعتماد اور بہادر ہوتے ہیں۔'' (۷)

''جاپان میں ایک مشاہدے میں یہ سامنے آیا کہ جب کچھ بچوں کو

مدافعتی ٹیکوں کی غرض سے لایا گیا ان میں سے وہ بچے جو ماں کا دُودھ پیتے تھے نہیں روئے اور جو روئے وہ بھی کم دیر تک اس کے مقابلے میں وہ بچے بہت روئے جو ماں کے دُودھ کی نعمت سے محروم رہے تھے۔ ایک اور تجربے سے یہ ثابت ہوا کہ وہ مائیں جو بچوں کو دُودھ پلاتی ہیں ان کے اور بچوں کے درمیان قربت اور تعلق بہ نسبت دوسرے بچوں کے زیادہ پایا گیا۔''(۸)

2 سال تک دُودھ پلانے کی پابندی اس لئے ہے کہ اس دوران بچے کی عادات پختہ نہیں ہوتیں جبکہ بعض مشاہدات میں دیکھا گیا ہے کہ جو بچے دو سال کے بعد بھی ماں کا دودھ پیتے رہے ان سے دودھ چھڑانے کے لیے ماہرین نفسیات اور دیگر ذرائع کا استعمال کرنا پڑا کیونکہ اس دور میں بچہ سمجھدار ہو جاتا ہے اور عادات کو چھوڑنے کے بجائے مستقل مزاجی اختیار کرتا ہے۔ دو سال تک وہ بھولا بھالا ہوتا ہے اس لیے دُودھ چھڑانا آسان ہے۔ دو سال کے بعد دودھ پلانے کے نقصانات میں سامنے آئے کہ بچوں کی نشوونما تھم سی گئی کیونکہ اس عمر میں انہیں ٹھوس غذا کی ضرورت ہوتی ہے۔

بعض مقامات پر دیکھا گیا ہے کہ بیٹوں کو تو دودھ پلوایا جاتا ہے مگر بیٹیوں کی حق تلفی کی جاتی ہے حالانکہ اس حوالے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اپنی اولاد کو کچھ دینے میں برابری کیا کرو اگر میں کسی کو زیادہ دے سکتا تو لڑکیوں کو زیادہ دیتا۔''

بچہ کتنے ہی خوف میں ہو، بے سکون ہو، بے چین ہو، بیمار ہو، جوں ہی ماں کے سینے سے لگتا ہے تمام بیماری دُور ہو جاتی ہے۔ اسے تحفظ و قربت کا احساس ملتا ہے۔ ماں کا دودھ پینے والے بچے پیشاب پاخانے کے حوالے سے زیادہ گندگی اور بدبودار فضلہ خارج نہیں کرتے اور بار بار اور بے وقت کرنے کے بجائے اوقاتِ مقررہ پر فارغ ہوتے ہیں۔

ایک زمانے میں متبادل کے طور پر ڈبے کے دودھ کی تشہیر کی گئی مگر پھر تحقیق سے یہ ثابت ہوا کہ خشک دودھ میں وہ اجزا نہیں ہوتے جو بچے کی صحت اور نشوونما کے لیے ضروری ہیں یعنی کچھ نہ کچھ کمی بچے کی غذا میں رہ جاتی ہے۔ اگر ماں کے لیے مکمل طور پر دودھ پلانا ممکن نہیں تو ارشادِ ربانی کی تعمیل میں معاوضے پر کسی دوسری عورت سے دودھ پلوانے کا اہتمام کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔ اس طریقے میں ایک سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہے کہ آپ کے معاشرے میں جو لوگ غریب ہیں ان کو ایک رزق کا ذریعہ ہاتھ آتا ہے کیونکہ دودھ پلانے کے لیے آپ جب کسی عورت کو تلاش کریں گے تو وہ غریب ہی عورت ہوگی جو معاوضے پر دودھ پلائے گی اور دودھ وہ لوگ معاوضے پر پلوائیں گے جو امراء ہیں اور خرچ برداشت کر سکتے ہیں۔ اس کے ذریعے دولت امیر سے غریب کی طرف جاتی ہے اور ایک اہم فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جس عورت کا دودھ بچہ پیتا ہے تو اس گھر کے لوگ اس بچے کے لیے خاندان کے فرد ہو جاتے ہیں گویا امیر اور غریب کے گھر کو ملانے کے لیے اور بہن بھائی بنانے کے لیے اور رشتۂ اخوت پیدا کرنے کے لیے یہ ایک انتہائی اہم اور اچھی چیز ہے جو ہمیں اختیار کرنی چاہیے۔''(۹) دودھ پلاتے وقت ممکن ہو تو وضو کر لیا جائے اور اس دوران اذکار اور ممکن ہو تو قرآنی سورتوں کی تلاوت کو معمول بنایا جائے۔

☆☆☆

حوالہ جات:


۱۔ القرآن الکریم، ص ۹۸، شاہ فہد قرآن کریم پرنٹنگ کمپلیکس سعودی عرب۔

۲۔ ایضاً۔

۳۔ ترجمہ قرآن مجید مع مختصر حواشی، سید ابوالاعلیٰ مودودی، ص ۱۱۳، ادارہ۔

۴۔ تعلیم القرآن، ڈاکٹر فرحت ہاشمی، دوسرا پارہ آڈیو کیسٹ، الہدیٰ انٹرنیشنل، کراچی ۲۰۰۲ء۔

۵۔ ایضاً

۶۔ ایضاً

۷۔ ایضاً

۸۔ ایضاً

۹۔ اولاد کی تربیت وحقوق، مقرر ڈاکٹر حسن الدین، احمد آڈیو کیسٹ ادارہ عکس وآواز۔

ڈاکٹر فضل عظیم

# اَلدِّیْنُ اَلنَّصِیْحَۃُ

عَنِ التَّمِیْمُ الدَّارِیؓ ، اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ ۔ ''اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ'' ۔ قُلْتُ لِمَنْ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ ۔ قَالَ لِلّٰہِ ، وَلِکِتَابِہٖ ، وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِاَ ئِمَّۃِ الْمُسْلِمِیْنَ وَعَامَّتِہِمْ ۔

تمیم الداریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''دین نصیحت ہے''۔ میں نے عرض کیا: ''یا رسولؐ اللہ کس کیلئے؟'' آپؐ نے فرمایا ''اللہ کے لئے، اس کی کتاب کے لئے، اس کے رسولؐ کے لئے، ائمۃ المسلمین کے لئے اور ان کے عوام کیلئے''۔

یہ حدیث ''جوامع الکلم'' میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو یہ خاص نعمت عطا فرمائی تھی کہ آپ چند لفظوں میں بہت وسیع مضامین بیان کر دیتے تھے۔ اس حدیث میں بھی پورے دین کی تعلیمات کو سمو دیا گیا ہے امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ کل مقاصد دین کو یہ حدیث جامع ہے اور اس پر عمل کر لینا گویا دین کے پورے منشاء کو ادا کر دینا ہے کیوں کہ دنیا کا کوئی شعبہ اور گوشہ ایسا نہیں جو اس حدیث کے مضمون سے باہر رہ گیا ہو۔

لفظ ''نصیحہ'' کے لغوی معنی خیر خواہی، ہمدردی، وفاداری اخلاص، بے لوث محبت اور دوستی کے ہیں، عربی لٹریچر میں اس لفظ کا استعمال اس طرح آتا ہے۔

نَصَحَ شَیْءٌ اِذَاخَلَصَ یعنی جو چیز بالکل خالص ہوتی ہے اسے ''نصح'' کہا جاتا ہے۔ نَصَحَتِ الْعَسَلُ یعنی یہ شہد بالکل خالص ہے۔

اس حدیث میں اللہ، اس کی کتاب، اس کے رسول، پیشوایان امت اور عوام الناس کے ساتھ وفاداری، ہمدردی، خیر خواہی اور اخلاص کو دین کہا گیا ہے۔ ذیل میں ہم اس کی تفصیلات بیان کرتے ہیں۔

و۔ نصیحہ کا لفظ جب اللہ کے لئے بولا جائے تو اس کے معنی اللہ تعالیٰ سے وفاداری اور اخلاص کے ہیں۔ اس کی درج ذیل پانچ صورتیں ہیں۔

۱۔ اللہ کو ماننا یعنی ایمان باللہ۔ یعنی اس بات کا یقین کرنا کہ اللہ موجود ہے اور اس کے وحدہٗ لاشریک ہونے (لاالٰہ الااللہ)، اس کے خالق کائنات (خلق السمٰوٰت والارض ...... خالق کل شیء) کائنات (للہ ما فی السموت و ما فی الارض) مالک و آقا، مربی، پرورش کرنے والا (رب العالمین) اور واحد صاحب امر، حاکم، مدبر و منتظم (الا لہ الخلق والامر) ہونے پر یقین کرنا۔ لا الٰہ الا اللہ میں یہ بات شامل ہے کہ صرف وہی معبود حقیقی یعنی عبادت کے لائق ہے، اسی کی بندگی اور غلامی کی جائے گی، اسی کی اطاعت وفرنبرداری اور پوجا پرستش ہوگی۔ باقی سب اطاعتیں اُس کی اطاعت کے طابع ہوں گی۔

۲۔ اللہ کو جاننا، یعنی معرفت الٰہی، اللہ کو جاننے کا ذریعہ اس کی صفات ہیں جو قرآن کریم میں بیان کی گئی ہیں یا نبی کریم ﷺ نے ہمیں بتائی ہیں یہ بہت وسیع مضمون ہے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

وَلِلّٰہِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْہُ بِھَا (الاعراف ۔ ۱۸۰)

''اور سب اچھے نام اللہ کے لئے ہیں انہی سے اس کو پکارو''

اللہ تعالیٰ کی سب سے اہم صفت جو قرآن کریم میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے خود بیان کی ہے وہ اس کا ''رحمٰن اور رحیم'' ہونا ہے۔ سورہ المومن میں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی ایک دعا نقل کی ہے جس میں وہ رب ذوالجلال سے عرض کرتے ہیں۔

''اے ہمارے رب تیری رحمت اور علم ہر چیز پر حاوی ہے بس معاف کر دے اور عذاب دوزخ سے بچا لے ان لوگوں کو جنہوں نے توبہ کی ہے اور تیرا راستہ اختیار کر لیا ہے اور داخل کر لے ان کو ہمیشہ رہنے والی جنتوں میں جن کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے''۔

(المومن ۔ ۷،۸)

یعنی اللہ تعالیٰ گناہوں کو بخشنے والا (غفور) ہے اور توبہ قبول کرتا ہے (قابل التوب)۔اس آیت میں رحمت کے ساتھ ساتھ اللہ کے علم کا ذکر کیا گیا ہے۔اس ساری کائنات میں اللہ ہی کی ہستی ایسی ہے جسے علم کل حاصل ہے۔کائنات کے ذرے ذرے پر اس کی نظر ہے۔ماضی، حال، مستقبل کی ہر چیز کا اس کو علم ہے۔اس کائنات میں اگر کسی مخلوق کو کوئی علم حاصل ہے تو وہ اس کا عطا کردہ ہے۔(ولا یحیطون بشیءٍ من علمہٖ الا بما شاءَ)

اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ''العزیز'' ہے یعنی وہ تمام قوتوں کا مالک ہے۔جو چاہے کرسکتا ہے۔اس کے فیصلوں کو نافذ ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قدیر (اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے) میں بھی یہی بات فرمائی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ زندگی اور موت کا مالک ہے (یُحْیِیْ وَ یُمِیْتُ) اَلرَّزَّاق یعنی بے حساب رزق دینے والا ہے، کوئی جاندار اس کائنات میں ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمہ نہ ہو۔صحت و بیماری، عزت و ذلت، ہدایت و گمراہی، غلبہ و محکومی، فتح و شکست سب اُسی کے حکم سے ہے۔

اللہ تعالیٰ خبیر، سمیع، بصیر اور مجیب ہے۔اپنے بندوں کے حال اور اعمال سے باخبر ہے ان کو ہر آن دیکھ رہا ہے ان کی دعائیں سنتا ہے اور قبول کرتا ہے وہ اول، آخر، باقی، وارث ہے جب کچھ نہیں تھا تو اللہ تھا جب کچھ نہیں ہوگا تو اللہ رہے گا (کُلُّ شیءٍ ہالک الا وجہ ...... کلّ من علیھا فانٍ وَّ یبقیٰ وجہ ربّک ذوالجلال والاکرام) اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہے۔وہ پاک ہے اس سے کہ کوئی غلط کام کرے۔

اللہ تعالیٰ احکم الحاکمین ہے۔دنیا میں بھی اسی کی بادشاہی ہے اور آخرت میں بھی بادشاہی اسی کی ہوگی۔ (اِنّا لنا لَلْآخرۃ وَ الْاولیٰ) اور آخرت میں سب انسانوں اور جنوں کو اس کی عدالت میں پیش ہونا ہوگا اور اسی کے کئے ہوئے فیصلے نافذ ہوں گے۔

## ۳۔ حب الٰہی (اللہ کی محبت)

اللہ سے محبت ایمان کا حصہ ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''اے نبیؐ لوگوں سے کہہ دو اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو۔اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا۔وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔''

(آل عمران ۔ ۳۱)

''کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا ہمسر اور مدمقابل بناتے ہیں اور ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی اللہ کے ساتھ ہونی چاہئے۔حالانکہ ایمان رکھنے والے سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں۔'' (البقرہ ۔ ۱۶۵)

اللہ تعالیٰ سے محبت کا لازمی تقاضا اللہ کی اطاعت ہے اگر کوئی اللہ کا نافرمان ہو اور اس کی محبت کا بھی دعویٰ کرے تو وہ شخص جھوٹا ہے اوپر والی آیت میں یہی بات کہی گئی ہے کہ اگر تم واقعی اللہ سے محبت کرتے ہو تو اس کا ثبوت رسول کریم ﷺ کی اطاعت کے ذریعے دو اور ظاہر ہے کہ رسولؐ کی اطاعت اصل میں اللہ ہی کی اطاعت ہے۔اگر ایسا کرو گے تو اس کے بدلے میں اللہ بھی تم سے محبت کرے گا۔اور تمہاری خطاؤں سے درگزر کریگا۔اس سے زیادہ خوش نصیب اور کون ہوگا جس سے اللہ محبت کرے اور اس کو گناہوں سے پاک صاف کردے۔

نبی کریم ﷺ نے ہمیں حصول محبت الٰہی کے لئے درج ذیل دعا سکھائی ہے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اَسۡئَلُکَ حُبَّکَ ، حُبَّ مَنۡ یُّحِبُّکَ وَالۡعَمَلَ الَّذِیۡ یُبَلِّغُنِیۡ حُبَّکَ ۔ اَللّٰھُمَّ اجۡعَلۡ حُبَّکَ اَحَبَّ اِلَیَّ مِنۡ نَّفۡسِیۡ وَ مَا لِیۡ وَاَہۡلِیۡ وَ مِنَ الۡمَاءِ الۡبَارِدِ ۔

اے اللہ! میں آپ سے سوال کرتا ہوں آپ کی محبت کا اور اس کی محبت کا جو آپ سے محبت کرے۔اور ایسے عمل کی جو پہنچادے مجھے آپ کی محبت تک۔ اے اللہ کردے اپنی محبت میرے لئے محبوب میری جان سے اور میرے مال سے اور میرے اہل وعیال سے اور ٹھنڈے پانی سے۔

اللہ سے محبت کے علاوہ اللہ کے لئے کسی سے محبت کرنا بھی اللہ کو

بے حد پسند ہے۔

حضرت انسؓ بن مالک بیان کرتے ہیں کہ ایک بدو نے رسول خداﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ قیامت کب ہوگی۔ رسول خداﷺ نے فرمایا ''تو نے قیامت کے لئے کیا تیاری کی ہے'' اس نے عرض کیا (کہ میری تیاری یہ ہے کہ میرے دل میں) خدا اور اس کے رسولﷺ کی محبت ہے۔ حضورؐ نے فرمایا تو قیامت کے دن انہی کے ساتھ ہوگا جن سے تجھے محبت ہے''

حضرت ابوذرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا کہ افضل ترین عمل یہ ہے کہ خدا ہی کے لئے دوستی رکھی جائے اور خدا ہی کے لئے دشمنی رکھی جائے۔ (ابوداؤد)

ایک اور حدیث میں رسول اللہﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی اللہ کی خاطر اپنے بھائی سے محبت رکھتا ہے تو اللہ بھی اسی طرح اس سے محبت رکھتا ہے۔ (مسلم)

اللہ کی محبت کے علاوہ دنیا میں اور بھی بہت سی چیزیں ہیں جن سے انسان فطری طور پر محبت کرتا ہے لیکن ایک مومن کے لئے یہ سب محبتیں اللہ کی محبت کے تابع ہوتی ہیں جہاں کسی بھی چیز کی محبت اللہ کی محبت کے منافی ہو وہاں اس کو اللہ کی خوشنودی کے لئے قربان کر دیا جاتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''اے نبیؐ کہہ دو اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز و اقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں تم کو اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس کی راہ میں جہاد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو یہاں تک اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے اور اللہ فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

(التوبہ ۔ ۲۴)

### ۴۔ اللہ کی اطاعت (اطاعت الٰہی)

ارشاد ربانی ہے۔

''میں نے جنوں اور انسانوں کو اپنی عبادت کے سوا اور کسی کام کے لئے پیدا نہیں کیا ہے۔ (الزاریات ۔ ۵۶)

لفظ عبادت کے مفہوم میں تین باتیں شامل ہیں۔

بندگی و غلامی، اطاعت و فرمانبرداری، پوجا و پرستش۔

بندگی و غلامی کی بنیاد عقیدہ ہے جس کا اللہ پر ایمان اور معرفت الٰہی کے تحت ذکر ہو چکا ہے۔ پوجا پرستش میں نماز، روزہ، ذکر، دعا، حج وغیرہ شامل ہیں، جن کے ذریعے انسان اپنے رب سے قریبی تعلق قائم کرتا ہے اور یہ تعلق انسان کو اللہ کی اطاعت کے لئے تیار کرتا ہے جو عبادت کا اصل مفہوم ہے۔ مومن اللہ تعالیٰ کا ہمہ وقتی بندہ و غلام ہے۔ اور دن رات میں وہ جو کام بھی سرانجام دیتا ہے اگر وہ اللہ کی مرضی اور اس کے حکم کے مطابق کرے یعنی اللہ کے ہر حکم کی اطاعت کرے تو وہ ہر وقت عبادت میں مصروف رہتا ہے۔ اللہ اور اس کے رسولﷺ نے ہمیں زندگی کے ہر شعبے کے بارے میں ہدایت دی ہیں کہ غلط کیا ہے اور صحیح کیا ہے۔ حرام کیا ہے، حلال کیا ہے، جائز کیا ہے، ناجائز کیا ہے۔ اطاعت کا رویہ یہ ہے کہ انسان ہر کام کرنے سے پہلے ان احکام کا خیال رکھے۔

قرآن کریم میں متعدد مقامات پر **اطیعوا اللّٰہ** کہہ کر انسانوں کو اللہ کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ جسے سورہ تغابن آیت ۱۲ میں فرمایا:

**أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ فَإِن تَوَلَّيْتُمْ فَإِنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ط ۔**

''اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو، لیکن اگر تم اطاعت سے منہ موڑتے ہو تو ہمارے رسولؐ پر صاف صاف حق پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں ہے''۔

اکثر مقامات پر جہاں **اطیعوا اللّٰہ** کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں اس کے ساتھ **اطیعوا الرسول** کا بھی حکم دیا گیا ہے کیونکہ رسولؐ کی اطاعت بھی اصل میں اللہ ہی کی اطاعت ہے۔

### ۵۔ اللہ سے ڈرنا

اللہ سے ڈرنا یعنی اللہ کی ناراضی سے ڈرنا۔ انسان کی زندگی کا مقصد اللہ کی رضا حاصل کرنا ہے۔ اسے ہر وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہے کہ اس سے کوئی ایسا کام نہ ہونے پائے جو اللہ کو ناراض کر دینے

والا ہو۔ اللہ سے ڈرنے کے لئے قرآن کریم میں تین لفظ استعمال ہوتے ہیں جن کے معنی قریب قریب ایک ہی جیسے ہیں۔

خوف ، خشیت ، تقویٰ

مثال کے طور پر:

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ط (الرحمٰن ۔ ۴۶)

''اور ہر اس شخص کے لئے جو اپنے رب کے حضور پیش ہونے کا خوف رکھتا ہو دو باغ ہیں۔''

یعنی جس نے دنیا میں خدا سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کی ہو اور یہ سمجھتے ہوئے کام کیا ہو کہ ایک روز مجھے اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونا اور اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔

اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِيْمٍ ط۔ (یٰس۔ ۱۱)

''تم تو اسی شخص کو خبردار کر سکتے ہو جو نصیحت کی پیروی کرے اور بے دیکھے خدائے رحمٰن سے ڈرے''

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ط (آل عمران ۔ ۱۰۲)

''اے لوگوں جو ایمان لائے ہو اللہ سے ڈرو جیسے اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو''۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ کے خوف اور ہیبت سے جس بندۂ مومن کی آنکھوں سے کچھ آنسو نکلیں، اگر وہ مقدار میں بہت کم مثلاً مکھی کے سر کے برابر (یعنی ایک قطرہ ہی کے بقدر) ہوں۔ پھر وہ آنسو بہہ کر اس کے چہرے پر پہنچ جائیں تو اللہ اس چہرے کو آتش دوزخ پر حرام کر دے گا۔ (ابنِ ماجہ)

حضرت عباسؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ جب اللہ کے خوف اور اس کی ہیبت سے کسی بندے کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں تو اس وقت اس کے گناہ ایسے جھڑتے ہیں جیسے کسی پرانے سوکھے درخت کے پتے جھڑتے ہیں۔ (رواہ البزار)

(جاری ہے)

آسیہ راشد

# قائداعظم محمد علی جناحؒ

## کی زندگی کا دینی وروحانی پہلو

قائداعظم محمد علی جناحؒ بانی پاکستان پر تاریخ نگاروں نے بے شمار کتب مقالے اور کالم لکھے ہیں۔ جن میں ان کی شخصیت کو ہر طرح اور ہر انداز سے پڑھنے والوں کیلئے بیان کیا ہے۔ ان کی زندگی کے ہر ہر گوشے کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ قائداعظم کی سوانح عمری ان کے افکار، ان کی تقاریر پر نگاہ دوڑائی جائے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بلاشبہ وہ اس صدی کے عظیم ترین لیڈر تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کیلئے جس طرح علیحدہ آزاد اسلامی ریاست کی جدوجہد کی اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

قائداعظم کے اسلامی نظریات کے بارے میں بہت کم لوگوں نے قلم اٹھایا ہے۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ کچھ دانشور حضرات اپنی کم علمی کی وجہ سے قائداعظم کو سیکولر قرار دیتے نظر آتے ہیں۔ قائداعظم نے تقسیم ہند سے پہلے اور بعد میں متعدد بار یہ اعلان کیا تھا کہ پاکستان کی بنیاد اسلامی اصولوں پر اٹھائی جائے گی اور پاکستان کے نظام، آئین اور ملکی ڈھانچے کو اسلامی اصولوں پر استوار کیا جائے گا۔

قائداعظم کوئی مذہبی شخصیت نہیں تھے۔ اپنے ظاہری خاکے میں وہ انگریزی لباس میں ملبوس فر فر انگریزی بولتے اپنے اصول وضوابط کے پابند دکھائی دیتے ہیں تب ہمارے ذہن میں لامحالہ یہ خیال ابھرتا ہے کہ شاید اسلام کے بارے میں وہ کوئی خاص علم نہ رکھتے ہوں گے مگر یہ ایک دلنشین حقیقت ہے کہ جیسا ان کا ظاہر اجلا اور صاف ستھرا تھا ویسا ہی ان کا باطن بھی قرآن فہمی اور حب رسولؐ سے بھرا ہوا تھا۔ وہ سچے، کھرے، بااصول اور اسلامی اصولوں کے شیدائی تھے۔ ان سطور میں ہم قائداعظمؒ کی زندگی کے دینی اور روحانی پہلوؤں کا ارتقائی جائزہ لیں گے۔ کسی بھی شخصیت کو جانچنے کیلئے اس کے بچپن کے حالات کا جائزہ لینا ضروری ہوتا ہے انسانی زندگی پر اس کے بچپن کے اثرات دوررس ہوتے ہیں۔

جب قائداعظم نے ہوش سنبھالا تو ان کی ابتدائی تعلیم وتربیت کیلئے ان کے والد پونجا جناح نے سندھ مدرسۃ الاسلام کا انتخاب کیا۔ معروف مصنف ومورخ رضوان احمد مرحوم نے گہری تحقیق اور محنت سے قائداعظمؒ کی زندگی کے ابتدائی سالوں پر کتاب لکھی ہے۔ ان کے مطابق قائداعظم کو بچپن میں قرآن مجید پڑھایا گیا تھا۔ جس طرح سارے مسلمان بچوں کو اس دور میں پڑھایا جاتا تھا۔ ان کی ہمشیرہ شیریں بائی کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں۔

”قائداعظم محمد علی جناحؒ کے والد پونجا جناح مشن سکول کے معلم تھے مگر بیٹے کو سکول میں داخل کرنے کا وقت آیا تو اسے مشن سکول کی بجائے ”سندھ مدرسۃ الاسلام“ میں داخل کروایا۔ پونجا جناح صرف تاجر ہی نہ تھے معلم بھی تھے بچپن کی تعلیم اور اس کے اثرات سے آگاہ تھے وہ جانتے تھے کہ ایک بچے کی ذہنی ساخت اور کردار سازی میں کون کون سی چیزیں دخیل ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان لوگوں کا ہاتھ بٹانے والے بھی تھے جنہوں نے سندھ مدرسۃ الاسلام کے قیام کی ضرورت محسوس کی اور اسے قائم کیا۔ وہ خود گھر پر بچوں کو قرآن شریف پڑھاتے تھے اور ماں بچوں کو مذہبی تاریخی کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔“

قائداعظم کے پرائیویٹ سیکرٹری جناب کے ایچ خورشید کی اہلیہ محترمہ ثریا خورشید جو محترمہ فاطمہ جناح کی سیکرٹری تھیں نے فاطمہ جناح پر ایک کتاب لکھی۔ ”محترمہ فاطمہ جناح کے شب وروز“ اس کے صفحہ 168 پر تحریر ہے......

مس فاطمہ جناح نے فرمایا: ”بچے کو بنیادی طور پر اپنے مذہب سے لگاؤ ہونا چاہیے بچپن میں اس کے دل میں مذہب کی محبت اسے بھٹکنے نہ دے گی۔“ قائداعظم کے مخالف ہمیشہ انہیں مغربی تہذیب کے دلدادہ

سمجھتے تھے۔ ان کی خوش پوشی اور روانی سے انگریزی بولنے کی مہارت سے غلط اندازے لگاتے تھے لیکن بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ قائداعظمؒ صحیح راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ انہیں اپنے مذہب سے والہانہ عقیدت تھی۔ اسی لئے نہ ہندو انہیں خرید نہ سکا نہ ہی انگریز کو یہ جرأت ہوئی کہ ان کے نظریات بدل سکے اس کے باوجود انہوں نے کبھی ایک مذہبی پیشوا ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔

ابتدائی تعلیم سندھ مدرسۃ الاسلام میں حاصل کرنے کے بعد جب وہ بیرسٹری کی اعلیٰ تعلیم کیلئے بیرون ملک روانہ ہوئے تو انہوں نے دوسرے اداروں کو چھوڑ کر لنکنز ان کا انتخاب کیا۔ قائداعظمؒ 1948ء میں کراچی بارایسوسی ایشن کے جلسہ عید میلادالنبیؐ سے خطاب کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ انہوں نے لنکنز ان کا انتخاب اس لئے کیا کہ اس ادارے میں دنیا کے عظیم قانون سازوں (Law Givers) کے اسمائے گرامی میں نبی کریمؐ کا نام بھی موجود تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ محمد علی کے باطن میں حب رسولؐ کی روشنی موجود تھی کہ انہوں نے نبی کریمؐ کے اسم گرامی کی وجہ سے لنکنز ان کا انتخاب کیا۔ سطحی نظر سے جذبے نظر نہیں آتے انہیں سمجھنے کیلئے گہرا مطالبہ اور غوروغوض ضروری ہوتا ہے۔ یہ بات باعث تعجب ہے کہ انگلستان سے واپس بمبئی پہنچ کر نوجوان قائداعظم نے پہلی بار جس تقریب میں شرکت کی وہ عید میلادالنبیؐ کی تقریب تھی۔ اس وقت کوئی محمد علی جناح کو جانتا بھی نہ تھا۔ اگلے سال بھی وہ اس تقریب میں موجود تھے۔ کیا یہ سمجھنا مشکل ہے کہ بظاہر ولایتی سوٹ پہننے والے جناح کے باطن میں رسولؐ کی محبت کی روشنی موجود تھی جو انہیں ان تقریبات میں کھینچ لائی تھی۔

قائداعظمؒ کی نجی زندگی کو دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ انہوں نے ایک پارسی لڑکی رتی ڈنشا سے پسند کی شادی کی تھی جو سرڈنشا کی بیٹی تھی لیکن شادی سے پہلے رتی نے اسلام قبول کیا اپنا نام مریم رکھا اور پھر اگلے روز محمد علی جناح نے ان سے شادی کی۔ محمد علی جناح فیشن ایبل مسلمان ہوتے تو رتی کو مسلمان کئے بناء ہی اس سے شادی کر لیتے لیکن انہوں نے ان کے دائرہ اسلام میں آنے کی شرط رکھی۔ جب رتی نے یہ شرط مان لی تو وہ اسے بمبئی کی جامع مسجد کے امام وخطیب مولانا نذیر احمد صدیقی کے پاس لے گئے جنہوں نے رتی کو مشرف با اسلام کیا۔ مولانا نذیر احمد صدیقی، مولانا شاہ احمد نورانی کے تایا تھے۔

قائداعظمؒ مسلم لیگ پر جاگیرداروں کے غلبے کانگریسی رویے اور مسلمانوں کی بے حسی کے سبب دل برداشتہ ہوکر 1930ء کے اواخر میں ہندوستان سے انگلستان چلے گئے تھے جہاں ان کی وکالت خوب چلی۔ انہوں نے نوابوں اور والیانِ ریاست کے پریوی کونسل کے مقدمات میں سے خوب دولت کمائی جس کی برکت سے وہ آخری وقت تک مالی دشواری سے بے نیاز رہے اعلیٰ معیارِ زندگی کے تقاضے پورے کرتے رہے۔ انہی دنوں علامہ اقبال نے انہیں ہندوستان واپس آنے پر مائل کیا کہ ہندوستان کے مسلمان آپ کی رہنمائی کے منتظر ہیں۔ جب نوابزادہ لیاقت علی خان اپنی بیگم رعنا کے ساتھ ہنی مون منانے لندن گئے تو انہوں نے بھی قائداعظمؒ سے ملاقاتیں کیں اور انہیں ہندوستان واپسی پر قائل کرنے کی کوششیں کی۔ خود آل انڈیا مسلم لیگ نے ایک قرارداد کے ذریعے قائداعظم سے واپسی کی درخواست کی اور مسلم لیگ کی قیادت سنبھالنے کی خواہش کا اظہار کیا لیکن ایک ایسا تاریخی راز بھی ہے جو اب تک لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے جس نے قائداعظم کے مایوس دل میں ایمان اور یقین محکم کے چراغ روشن کیے۔ انہیں ہندوستان واپس آنا پڑا اور ان کی آمد قیام پاکستان کا باعث بنی۔

یہ راز ایک ایسا خواب ہے جو قائداعظم نے دیکھا۔ اس واقعے کے راوی چودھری فضل حق ہیں اور ان کے راوی مولانا شبیر علی عثمانی ہیں ان دونوں حضرات کا تعلق اس کلاس سے ہے جنہیں دنیا سے بڑھ کر عاقبت زیادہ عزیز ہوتی ہے جو کسی بھی جھوٹ کے بے لذت گناہ کا ارتکاب نہیں کرتے۔ چودھری فضل حق پنجاب، سندھ، بلوچستان اور پنجاب کے آئی جی پولیس رہے ہیں۔ ان کی نعت گوئی عشق رسولؐ کی دین ہے ان کی شہرت پابند صوم وصلوٰۃ نیک اور بھلے انسان کی ہے۔ انہوں نے نظریہ پاکستان کونسل اسلام آباد کے ماہنامے ''نظریہ'' میں لکھا......

45-1944ء میں اپنے قیام دہلی کے دوران وہ کبھی کبھار قائداعظم کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ وہیں علامہ شبیر احمد عثمانی سے ملاقات ہوئی جو بعد میں نیازمندی میں بدل گئی۔ علامہ شبیر احمد عثمانی نے ایک ملاقات میں قائداعظم کی وفات کے بعد بتایا کہ قائد مرحوم نے انہیں ایک نشست میں بتایا تھا کہ وہ لندن کی خود اختیار کردہ جلاوطنی کو سرور کائناتؐ کے حکم پر ختم کر کے ہندوستان واپس آئے تھے جو انہیں سرور کائناتؐ نے ایک خواب میں دیا تھا۔ اس خواب کی تفصیل بتاتے ہوئے قائد نے بتایا کہ رسولؐ کا حکم نہایت واضح تھا۔ آپؐ نے دوٹوک الفاظ میں فرمایا تھا ''محمد علی واپس ہندوستان جاؤ اور وہاں کے مسلمانوں کی قیادت کرو۔''

قائداعظم نے یہ خواب سنا کر تاکید کی تھی کہ اس خواب کا ذکر ان کی زندگی میں کسی سے نہ کیجئے گا۔ پھر قائداعظم جلاوطنی ختم کر کے ہندوستان واپس آئے، مسلم لیگ کے تن مردہ میں نئی روح پھونکی اور مطالبہ پاکستان پر ڈٹ گئے۔ چودھری فضل حق نے کہا میرے نزدیک قائداعظم کا مطالبہ پاکستان پر اصرار اور اس کی راہ میں کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہ لانا اسی وجہ سے تھا کہ اس کا حکم سرور کائناتؐ نے دیا تھا۔ اسی باعث میرا ایمان ہے کہ پاکستان کا مستقبل نہایت روشن ہے اور ہماری تمام تر کوتاہیوں اور کمزوریوں کے باوجود پاکستان قائم و دائم رہے گا۔

ہندوستان تشریف لانے کے بعد ایک نجی مجلس میں حضرت قائداعظم نے مولانا ظفر علی خان اور سردار عبدالرب نشتر کی موجودگی میں جو کچھ فرمایا اس سے ان کی مومنانہ فراست چھلکتی ہے اس کا مفہوم کچھ یوں بنتا ہے......

''میں نے علامہ اقبالؒ کی دعوت پر دولت اور منصب دونوں کو تج کر انڈیا میں محدود آمدنی کی دشوار گزار زندگی بسر کرنا پسند کیا تاکہ پاکستان وجود میں آئے اور اس میں اسلامی قوانین کا بول بالا ہو کیونکہ دنیا کی نجات ''اسلامی نظام'' میں ہے۔ صرف اسلام ہی کے علمی و عملی اور قانونی دائروں میں آپ کو عدل، مساوات، اخوت، محبت، سکون اور امن دستیاب ہو سکتا ہے۔ میں یہ دیکھ رہا ہوں انڈین کانگریس حکومت بنانے کے بعد برطانوی ٹھگوں کو تو یہاں سے نکال دے گی مگر پھر خود ٹھگ بن جائے گی۔ یہ لوگ صرف مسلمانوں کی ہی آزادی ختم نہیں کریں گے بلکہ اپنے لوگوں کی آزادی بھی ختم کر دیں گے، اس لئے ہم سب کو پاکستان کے قیام کے لئے زبردست کوشش کرنی چاہیے۔ ذرا خیال فرمایئے کہ اگر لا الہ الا اللہ پر مبنی حکومت قائم ہو جائے تو افغانستان، ایران، ترکی، اردن، بحرین، کویت، حجاز، عراق، فلسطین، شام، تیونس، مراکش، الجزائر اور مصر کے ساتھ مل کر یہ کتنا عظیم الشان بلاک بن سکتا ہے۔ (قائداعظم کا مذہب وعقیدہ۔ صفحہ 188)

قائداعظم جب انگلستان سے واپس آئے تو بہت سے علماء کرام نے ان سے ملاقاتیں کیں اور اپنے وفود بھیجے تاکہ ان سے مل کر ان کے خیالات جان سکیں۔ اور بہت سوں نے اپنے اپنے طور پر نئی مملکت پاکستان میں شریعت کی عملداری کیلئے اپنے اپنے مشوروں سے نوازا۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قائداعظم کی دینی تربیت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ہدایت پر ان کے ساتھیوں اور خواہرزادوں نے کی تھی۔ جن سے قائداعظم کی طویل ملاقاتیں رہیں۔ ان ملاقاتوں کا نتیجہ تھا کہ انگلستان سے واپسی کے بعد قائداعظم کی تقریروں پر واضح مذہبی رنگ نظر آتا ہے۔ ان کی تقریروں میں جابجا مذہبی حوالے ملتے ہیں۔ خدا کے سامنے جوابدہی کا خوف طاری ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ قائداعظم کی تقاریر کو بغور پڑھنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ 1934ء کے بعد ان کے نظریات میں ایک واضح تبدیلی نظر آتی ہے۔ مذہب کی جانب جھکاؤ دکھائی دیتا ہے۔ ان کے تصور قومیت اور سیاست میں بنیادی تبدیلی دکھائی دیتی ہے۔ ظاہر ہے قائداعظم کوئی مذہبی شخصیت نہیں تھے اور نہ ہی علامہ اقبال کی طرح ان کی کوئی مذہبی تربیت ہوئی تھی وہ ایک کھرے اور سچے مسلمان تھے۔ انہوں نے اپنے طور پر قرآن حکیم، سیرت نبویؐ اور اسلامی نظام حکومت کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ وہ قرآنِ حکیم پر غور وفکر کرتے تھے۔

ہماری نئی نسل مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مقام و مرتبے سے ناآشنا ہے۔ آپ بہت بڑے سکالر، تفسیر قرآن اور سیرت نبویؐ کے عظیم

مصنف اور بڑی روحانی شخصیت تھے۔ ایسی شخصیت کا مسلمانوں کے بارے میں متفکر رہنا قابل فہم ہے۔ مولانا شبیر علی تھانوی کی ''روئیداد'' تبلیغ کا حوالے دیتے ہوئے منشی عبدالرحمٰن نے لکھا ہے......

''حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی دوپہر کا کھانا نوش فرما کر قیلولہ کیلئے خانقاہ تشریف لائے اور مجھے آواز دی۔ میں حاضر ہوا تو حضرت متفکر تشریف فرما تھے۔ (یہ مئی 1938ء کا واقعہ ہے) اس زمانے تک قرار داد پاکستان منظور نہیں ہوئی تھی مگر کانگریس اور ہندوؤں کی ذہنیت بے نقاب ہوچکی تھی...... حضرت نے دوتین منٹ کے بعد سر اٹھایا اور ارشاد فرمایا۔ میاں بشیر علی ہوا کا رخ بتا رہا ہے کہ لیگ والے کامیاب ہوجاویں گے اور بھائی جو سلطنت ملے گی وہ ان ہی لوگوں کو ملے گی جن کو آج ہم فاسق فاجر کہتے ہیں۔ مولویوں کو تو ملنے سے رہی۔ لہٰذا ہم کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ یہی لوگ دین دار بن جاویں۔ آج کل کے حالات میں اگر سلطنت مولویوں کو مل بھی جاوے تو شاید چلا نہ سکیں گے...... ہم کو تو صرف یہ مقصد ہے کہ جو سلطنت قائم ہو وہ دیندار لوگوں کے ہاتھ میں ہو اور بس...... میں نے ارشاد سن کر عرض کیا کہ پھر تبلیغ نیچے کے طبقہ سے شروع ہو یا اوپر کے طبقہ یعنی خواص سے۔ اس پر ارشاد فرمایا کہ اوپر کے طبقہ سے کیونکہ وقت کم ہے اور خواص کی تعداد بھی کم ہے۔ اگر خواص دیندار بن گئے تو انشاء اللہ عوام کی بھی اصلاح ہوجائے گی۔

اس پس منظر اور اس جذبے کے تحت مولانا اشرف علی تھانوی نے ایک وفد ترتیب دیا، نواب محمد اسمٰعیل کے ذریعے قائداعظم سے ملاقات کا انتظام کیا۔

25 دسمبر 1938ء کو شام پانچ بجے یہ وفد قائداعظم سے ملا۔ ملاقات ایک گھنٹہ جاری رہی۔ جس کی تفصیل مولانا شبیر علی تھانوی کی ''روئیداد'' میں موجود ہے۔ اس وفد کے سربراہ مولانا مرتضٰی حسن تھے اور اس وفد میں مولانا شبیر علی تھانوی، مولانا عبدالجبار، مولانا عبدالغنی، مولانا معظم حسنین اور مولانا ظفر احمد عثمانی شامل تھے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی اور ظفر احمد عثمانی سگے بھائی تھے اور مولانا اشرف علی تھانوی کے بھانجے تھے جبکہ مولانا شبیر علی تھانوی ان کے بھتیجے تھے۔ مولانا شبیر والدہ کی علالت کے سبب اجلاس میں نہ جاسکے۔

وفد کے تاثرات ان الفاظ میں جھلکتے ہیں۔

''ہم ان کے جوابات سے متاثر ہوئے۔ ان کے کسی دینی عمل کی کوتاہی کے متعلق عرض کیا گیا تو بغیر کسی تاویل و حجت اپنی کوتاہی کو تسلیم کیا اور آئندہ اصلاح کا بھی وعدہ کیا۔ یہ صرف حضرت تھانویؒ کا روحانی فیض کام کر رہا تھا ورنہ جناح صاحب کسی بڑے سے بڑے کا اثر بھی قبول نہیں کرتے تھے۔ اس ملاقات کی تفصیل دلچسپ اور فکر انگیز ہے جس میں قائداعظم نے کہا ''میں گناہگار ہوں...... وعدہ کرتا ہوں، آئندہ نماز پڑھا کروں گا۔ (بحوالہ منشی عبدالرحمٰن صفحہ 26)

دوسری ملاقات 12 فروری 1939ء کو دہلی میں شام سات بجے ہوئی۔ اڑھائی گھنٹے کی اس ملاقات کے بعد قائداعظم نے کہا کہ ''میری سمجھ میں آ گیا ہے کہ اسلام میں سیاست سے مذہب الگ نہیں بلکہ مذہب کے تابع ہے (بحوالہ روئیداد مولانا شبیر احمد تھانوی صفحہ ۷) اس ملاقات میں مولانا شبیر علی تھانوی کے ساتھ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب تھے مولانا اشرف علی تھانوی کے نمائندے مئی 1947ء تک قائداعظم سے ملتے رہے اور ان کی دینی تربیت کرتے رہے۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خواہرزادے ظفر احمد عثمانی فرماتے ہیں کہ حضرت تھانوی نے ایک روز طلب فرما کر مجھے کہا۔

''میں خواب بہت کم دیکھتا ہوں۔ مگر آج میں نے عجیب خواب دیکھا ہے میں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا مجمع ہے گویا کہ میدان حشر سا معلوم ہو رہا ہے۔ اس مجمع میں اولیاء، علماء، صلحاء کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں مسٹر محمد علی جناح بھی اسی مجمع کے ساتھ عربی لباس پہنے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھے ہیں میرے دل میں خیال گزرا کہ یہ اس مجمع میں کیسے شامل ہوگئے تو مجھ سے کہا گیا محمد علی جناح آج کل ''اسلام'' کی بڑی خدمت کر رہے ہیں اسی واسطے ان کو یہ درجہ دیا گیا۔'' (تعمیر پاکستان اور علماء ربانی صفحہ ۱۱۱)

4 جولائی 1943ء کو حضرت تھانویؒ نے مولانا شبیر احمد عثمانی اور ظفر احمد عثمانی کو طلب فرما کر ارشاد فرمایا۔

1940ء کی قرارداد پاکستان کو کامیابی نصیب ہوگی۔ میرا وقت آخری ہے۔ اگر میں زندہ رہتا تو ضرور کام کرتا۔ مشیت ایزدی یہی ہے کہ مسلمانوں کیلئے ایک علیحدہ خطہ بنے۔ قیامِ پاکستان کیلئے جو کچھ ہو سکے کرنا اپنے مریدوں کو بھی کام کرنے پر ابھارنا۔ تم دونوں عثمانیوں میں سے ایک میرا جنازہ پڑھائے گا اور دوسرا عثمانی جناح صاحب کا جنازہ پڑھائے گا۔ (قائداعظم کا مذہب وعقیدہ صفحہ ۲۴۹)

حکیم الامت حضرت علامہ اقبال نے 8 مئی 1936ء کو ایک بیان اشاعت کیلئے دیا جس کا عنوان تھا ''مسلمانان پنجاب کے نام ایک اہم اپیل'' اس میں قائداعظم کی زبردست تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

''بطل جلیل مسٹر محمد علی جناح ان قابل فخر مسلم رہنماؤں میں سے ہیں جن کی سیاسی دانش ہمیشہ مسلمانوں کیلئے صبر آزما وقتوں میں مشعل راہ کا کام کرتی ہے جس خلوص اور عزیمت کے ساتھ انہوں نے مسلمانان ہند کی تمام اہم اور نازُک موقعوں پر خدمت کی ہے اس کے لئے مسلمانوں کی آنے والی نسلوں کے سر عقیدت واحترام کے ساتھ جھکے رہیں گے۔''

قائداعظم کی ذات سے نواب بہادر یار جنگ کو والہانہ عقیدت تھی۔ سرینگر میں آکر مجلس عاملہ میں شریک ہوئے تو بغیر کسی تمہید کے قائداعظم کی مدح میں موتی بکھیرنے شروع کر دیئے اور فرمایا: ''قائداعظم قائد نہیں اللہ کی رحمت ہے جو ہم مسلمانوں پر آسمان سے نازل ہوئی ہے۔'' سید سلیمان ندوی نے قائداعظم کی مدح میں اشعار کہے۔ امیر ملت حضرت پیر جماعت علی شاہ محدث علی پوری نے تمام زندگی اسلام کی سربلندی کیلئے وقف کیے رکھی ان پر قائداعظم کی قلبی کیفیات منشکف ہو چکی تھیں انہوں نے قائداعظم کی تائید فرمائی جس کے نتیجے میں پورے ملک میں پھیلے ہوئے آپ کے مرید اور ارادت مند مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔

جماعت اسلامی کے 1941ء کے قیام کے کچھ عرصے بعد جماعت کے سیکرٹری جنرل جناب قمر الدین خان کو دہلی بھجوایا گیا جہاں جماعت کی درخواست پر ہندوستان کی ممتاز مذہبی شخصیت راجہ محمود آباد نے ان کی قائداعظم محمد علی جناح سے ملاقات کا اہتمام کیا تھا۔ یہ ملاقات قائداعظم کی رہائش گاہ پر ہوئی اور کوئی پینتالیس منٹ تک جاری رہی۔ اس ملاقات میں قمر الدین خان صاحب نے جماعت اسلامی کے منشور، سرگرمیوں اور پروگرام پر روشنی ڈالی اور قائداعظم سے کہا کہ وہ اسلامی ریاست کے قیام کا وعدہ کریں۔ قائداعظم نے مختصر مگر واضح جواب دیا اور کہا کہ آپ کے مسلم لیگ کے پروگرام میں کوئی تفاوت نہیں اور تضاد نہیں لیکن حالات جس قدر تیزی سے بدل رہے ہیں اور سیاست میں جس رفتار سے پیش رفت ہو رہی ہے ہم صرف اسلامی ریاست کی نوعیت اور تشریح پر اٹک کر نہیں رہ سکتے۔ ان کے الفاظ تھے ''میں مسلمانوں کیلئے علیحدہ وطن کیلئے جدوجہد کرتا رہوں گا اور آپ بھی اس سلسلے میں اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ یہ ضروری نہیں ہمارے پلیٹ فارم ایک ہی ہوں۔'' پھر قائداعظم نے رک کر کہا ''میں مسجد کیلئے زمین چاہتا ہوں جب ہمیں اس مقصد کیلئے زمین مل جائے تو ہم مل کر فیصلہ کر سکتے ہیں کہ مسجد کیسے تعمیر کرنی ہے۔''...... قمر الدین صاحب قائداعظم کی بات سن کر اور خاص طور پر مسجد کے استعارے سے بہت خوش ہوئے قائداعظم نے انہیں انتباہ کرتے ہوئے کہا ایک آزاد مسلمان ریاست کا قیام ہماری اولین ترجیح اور مقصد ہے۔ جہاں تک روحانی پاکیزگی اور بالیدگی کا تعلق ہے وہ بعد کی بات ہے۔'' اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قمر الدین صاحب نے روحانی پاکیزگی پر زور دیا تھا۔ اسی پس منظر میں جماعت اسلامی نے قیام پاکستان کے بعد اپنے دینی اور تربیتی پروگرام کا آغاز کیا اور مولانا مودودیؒ کو ریڈیو پاکستان سے درس وتدریس کی اجازت دی گئی لیکن قائداعظم کے انتقال کے بعد جماعت اسلامی بھی زیر عتاب آگئی۔ (بحوالہ ارتقائے پاکستان شریف الدین پیرزادہ)

قائداعظم کے روحانی پیشواؤں میں ایک بزرگ ''غازی'' (کے نام سے معروف تھے) کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ کسی زمانہ میں بغداد میں سونے کا کاروبار کرتے تھے جہاں ان کا لاکھوں میں بینک بیلنس تھا رولز رائس موٹر ان کے نیچے رہتی تھی۔ نیک نیت اور اسلام دوست انسان تھے۔ وہاں ان کی کوئی ایسی کایا پلٹ ہوئی کہ وہ قائداعظم کی روحانی اصلاح کیلئے مامور من اللہ ہو کر امرتسر پہنچ گئے۔ انہوں نے لاہور میں کتابوں کا کاروبار شروع کیا اور تاج کمپنی کے قرآن لے کر حالات کا جائزہ لینے کیلئے ملک کے طول وعرض میں دورے کرتے رہے اور اپنا اثر ورسوخ اس قدر بڑھا لیا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے

پنجاب کی طرف سے رکن بن کر قائداعظم کے اتنے مقرب و معتمد بن گئے کہ اگر کسی لیڈر نے ان سے کوئی کام نکلوانا ہوتا تو ان کی معرفت کام نکلواتا۔ علاوہ ازیں وہ علامہ شبیر احمد عثمانی کے بڑے منظور نظر تھے اور علماء اشرافیہ کے بڑے مداح اور معتقد تھے۔

بظاہر وہ ایک تاجر کتب تھے مگر بباطن وہ ابدال تھے۔ مشہور زمانہ مصنف، دانشور محمد شریف طوسی جن کا تعلق وزیرآباد سے تھا ان کے مقالات نے برصغیر پاک و ہند میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ ان کے مقالات پڑھ کر قائداعظم نے انہیں اپنے پاس بلایا چھ ماہ اپنے پاس رکھا اور انگریزی کی کئی کتابیں ان سے تحریر کروائیں (جن میں ان کے تمام مضامین کو اکٹھا کرنا اور کتابی شکل دینا تھا) انہوں نے اپنی یادداشتیں قائداعظم کے ساتھ چھ مہینے'' کے عنوان سے تحریر کیں جن کا ترجمہ ان کے صاحبزادے ہارون رشید طوسی صاحب نے کیا۔ انہوں نے قائداعظم کی گھریلو زندگی پر بھی بڑے متجسس انداز میں نگاہ ڈالی ہے۔

وہ کہتے ہیں ''ان کی لائبریری میں اسلامی تاریخ رسول اکرمؐ کی حیات طیبہ، دیگر اسلامی رہنماؤں اور قرآن حکیم کے تراجم پر مشتمل کتابیں تھیں انہوں نے شبلی نعمانی کی کتاب الفاروق کے انگریزی ترجمے کا مطالعہ کر رکھا تھا وہ اس کتاب کے حصہ دوم کا مطالعہ کرنا چاہتے تھے جس میں حضرت عمرؓ کی طرزِ حکومت اور اصلاحات کا ذکر تھا لیکن اس کا انگریزی ترجمہ دستیاب نہ ہوسکا۔ اپنے فرصت کے اوقات میں قائداعظم قرآن حکیم کا انگریزی ترجمے جو کہ علامہ یوسف علی نے لکھا اور سید امیر علی کی لکھی ہوئی کتب کا مطالعہ کرتے "Spirit of Islam and history of Saraneen"

18 جنوری 1943ء کو تقریباً شام پانچ بجے کا وقت تھا اور معمول کے مطابق قائداعظم اپنی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح کے ہمراہ اپنے مالا بار ہل بمبئی پر واقع شاندار بنگلے کے وسیع و عریض لان میں چہل قدمی کر رہے تھے کہ تین باریش نوجوان جو دیرہ دون سے آئے تھے قائداعظم سے ملنے کے خواہش مند ہوئے۔ میں اس وقت دفتر میں موجود تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ وہ پیشگی ملاقات کا وقت لئے بغیر نہیں مل سکتے۔ اور اس وقت قائداعظم سیر کیلئے تشریف لے جا چکے ہیں۔ اس سلسلے میں میں ان سے ایک تند و تیز بحث میں الجھ گیا۔ اسی وقت مسٹر جناح اور ان کی ہمشیرہ رہائش گاہ کے بڑے دروازے میں داخل ہوئے۔ جب قائداعظم نے میری طرف دیکھا تو میری طرف آئے اور کہا مسٹر طوسی یہ سب شور شرابا کس لئے ہو رہا ہے؟ اور آپ اس قدر اونچی آواز میں کیوں بول رہے ہیں! ہم سب کھڑے ہو گئے اور میں جلدی میں کہہ بیٹھا'' جناب یہ لوگ جاننا چاہتے ہیں کہ کیا آپ اسلام کے احکامات پر عمل پیرا ہیں؟ کیونکہ آپ مسلمانوں کے قائداعظم ہیں۔'' مسٹر جناح مکمل طور پر پرسکون رہے وہ ہمیں اپنے دفتر لے گئے اور ہمیں بیٹھنے کیلئے کہا پھر وہ تینوں نوجوانوں سے یوں مخاطب ہوئے۔'' آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آیا میں اسلامی احکامات پر عمل پیرا ہوں یا نہیں اس کا پرزور جواب یہ ہے کہ جی ہاں! اور میری یہ دلی خواہش ہے کہ میں اسلام پر مکمل طریقے سے عمل پیرا ہو جاؤں کیونکہ اسلام کو ایک مکمل ضابطہ حیات سمجھتا ہوں جو کہ ہماری زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہے لیکن میں کوئی مذہبی رہنما یا مولانا نہیں ہوں۔ میں صرف ایک وکیل ہوں جو کہ پاکستان کے حصول کیلئے مسلمانوں کا مقدمہ برطانوی حکومت سے لڑ رہا ہے۔ مجھے برطانوی حکومت مرعوب نہیں کر سکتی کیونکہ میرا مکمل ایمان اس مقدمے کی سچائی پر ہے جو کہ میں پیش کر رہا ہوں اور اگر کوئی لیڈر، مسلمان یا مولانا (مذہبی رہنما) جو کہ مسلمانوں کا مقدمہ لینے کو تیار ہے تو اسے آگے آنا چاہیے اس صورت میں میں اس کے حق میں دستبردار ہو جاؤں گا۔ جہاں تک میری ذاتی زندگی کا تعلق ہے یہ سب کے سامنے کھلی کتاب کی طرح ہے۔ میں اپنے عوام سے کچھ نہیں چھپاتا۔

20 مارچ 1943ء کو میں قائداعظم کے دفتر 10 اورنگ زیب روڈ دہلی میں موجود تھا۔ ایک متشرع عالم دین جو کہ ایک متاثر کن شخصیت کے مالک تھے جن کا نام مولوی محمد منور الدین تھا ملنے کیلئے تشریف لائے ان کے پاس اسلامی قوانین کے متعلق نمونے کی کتابیں تھیں جنہیں وہ سلسلہ وار کتابوں کے 50 حصوں کی شکل میں شائع کر رہے تھے۔ ان میں سے ہر کتاب اسلامی فلسفہ قانون کے کسی خاص موضوع کے متعلق تھی۔ انہوں

نے قائداعظم سے طویل ملاقات کی اور اپنی کتابوں کی تفصیل بتائی۔

قائداعظم نے ان کی باتیں غور سے سنیں اور ان سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے بتایا۔ ''اسلام ایک مکمل ضابطہ قوانین ہے اور مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی کرتا ہے۔'' ......انہوں نے قرآن حکیم کے احکامات اور رسول کریمؐ کی ہدایت اور تعلیمات کو ایک قوانین کی شکل دینے کے مفید کام کی بہت تعریف کی۔ قائداعظم نے یہاں تک کہا کہ اگر ان کے ہاتھ میں کسی ملک کی باگ ڈور ہوتی تو وہ فی الفور مسلمان علماء کی ایک کمیٹی کا قیام عمل میں لاتے جو کہ مولانا کی لکھی ہوئی کتابوں کا مطالعہ کرتی اور جہاں تک ممکن ہوتا وہ ان قوانین کا دیوانی اور فوجداری عدالتوں میں نفاذ کر دیتے۔ انہوں نے مصنف کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی کتابوں کی کاپیاں آزاد مسلمان سلطنتوں کے سربراہوں کو بھیجیں۔''

ملاقات کے بعد مولانا منور الدین نے مجھے بتایا کہ وہ مکمل قائداعظم کی گفتگو سے مطمئن ہیں اور وہ حضرت قائداعظم کو ایک ایسا مخلص اور پکا مسلمان تسلیم کرتے ہیں جس نے برصغیر کے مسلمانوں کیلئے اپنی زندگی وقف کر رکھی ہے۔ جب پاکستان معرض وجود میں آجائے گا تو قائداعظم شرعی قوانین کا نفاذ کریں گے اور ملک کا قانون قرآن وسنت پر مبنی اسلامی اصول وضوابط کے مطابق بنایا جائے گا۔

قائداعظمؒ کی سحر خیزی کے بارے میں بہت سے اصحاب نے بتایا لیکن جس انداز سے مولانا حسرت موہانی نے ذکر کیا وہ ان کی روشن ضمیری اور یقین وایمان کی اعلیٰ اقدار کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

''میں ایک روز جناح صاحب کی کوٹھی پر صبح ہی صبح نہایت ضروری کام سے پہنچا اور ملازم کو اطلاع کرنے کو کہا۔ ملازم نے کہا اس وقت ہمیں اندر جانے کی اجازت نہیں ہے آپ تشریف رکھیے۔ مجھے ضروری کام تھا اور میں جلدی میں تھا اس لئے مجھے ملازم پر غصہ آیا اور میں خود کمرے میں چلا گیا۔ ایک کمرے سے دوسرے کمرے اور پھر تیسرے کمرے میں پہنچا تو برابر کے کمرے سے مجھے کسی کے بلک بلک کر رونے کی اور کچھ کہنے کی آواز آئی۔ چونکہ جناح صاحب کی آواز تھی اس لئے میں گھبرایا اور آہستہ سے پردہ اٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ سجدے میں پڑے ہیں اور بہت ہی بے قراری کے ساتھ دعا مانگ رہے ہیں۔ میں دبے پاؤں وہیں سے واپس آ گیا اور اب تو بھائی جب جاتا ہوں اور ملازم کہتا ہے کہ اندر ہیں تو میں یہی سمجھتا ہوں کہ وہ سجدے میں پڑے ہوئے دعا کر رہے ہیں۔ میرے تصور میں ہر وقت جناح صاحب کی وہی تصویر اور وہی آواز رہتی ہے۔ (زندہ قائداعظم صفحہ ۲۳)

اکثر لوگ پوچھتے ہیں کہ قائداعظم کی تقاریر میں جابجا قرآن حکیم سے رہنمائی کا ذکر ملتا ہے کیا انہوں نے قرآن مجید پڑھا ہوا تھا اور کیا وہ قرآن مجید سے رہنمائی لیتے تھے۔

جنرل اکبر قیام پاکستان کے وقت بحیثیت میجر جنرل کمانڈر فرسٹ کور تعینات ہوئے وہ اپنی سوانح عمری ''میری آخری منزل'' میں لکھتے ہیں...... ''جن دنوں قائداعظم زیارت میں بیماری سے برسرپیکار تھے انہوں نے جنرل اکبر اور ان کی بیگم کو تین دن کیلئے زیارت میں بطور مہمان بلایا اور اپنے پاس جنرل اکبر 25 جون 1948ء کو وہاں پہنچے ان کی قائداعظم سے کئی ملاقاتیں ہوئیں ایک ملاقات کے ذکر میں وہ لکھتے ہیں...... ہمارے افسروں کے سکولوں میں ضیافتوں کے وقت شراب سے جام صحت پیا جاتا ہے کیونکہ یہ افواج کی قدیم روایت ہے میں نے قائداعظم سے کہا کہ شراب کے استعمال کو ممنوع کرنے کا اعلان فرمائیں۔ قائداعظم نے خاموشی سے اپنے اے ڈی سی کو بلایا اور حکم دیا کہ میرا کانفیڈریشن باکس لے آؤ۔ جب بکس آگیا تو قائداعظم نے چابیوں کا گچھا اپنی جیب سے نکال کر بکس کو کھول کر سیاہ مراکشی چمڑے سے جلد بند ایک کتاب نکالی اور اسے اس مقام سے کھولا جہاں انہوں نے نشانی رکھی ہوئی تھی اور فرمایا جنرل یہ قرآن مجید ہے اس میں لکھا ہوا ہے کہ شراب ومنشیات حرام ہیں۔ کچھ تبادلہ خیال کے بعد سٹینو کو بلوایا گیا۔ قائداعظم نے ایک مسودہ تیار کیا۔ قرآنی آیات کا حوالہ دے کر فرمایا ''شراب ومنشیات حرام ہیں'' میں نے اس مسودے کی نقل لگا کر اپنے ایریا کے تمام یونٹ میں شراب بند کرنے کا حکم جاری کیا جو میری ریٹائرمنٹ تک موثر رہا۔ میں نے قائداعظم سے عرض کیا کہ ہم نے بنیادی طور پر آپ کی تقریروں سے رہنمائی حاصل کی۔ آپ نے فرمایا ہم مسلمانوں کو زندگی کے ہر شعبے میں قرآن مجید سے رہنمائی لینی چاہیے۔ ہم نے دفاعی نقطہ نظر پر

ریسرچ شروع کردی ہے اور کچھ مواد بھی جمع کر لیا ہے۔ قائداعظم نے اس تحریک کو پسند فرمایا۔ ہماری ہمت افزائی ہوگئی۔ (صفحہ ۲۸۲)

منیر احمد منیر اپنی کتاب ''دی گریٹ لیڈر'' میں قائداعظم کے گورنر ہاؤس پشاور کے بٹلر عبدالرشید سے لئے گئے اہم انٹرویو کے حوالے سے لکھتے ہیں بٹلر نے بتایا۔

''میری ڈیوٹی ان کے کمرے پر تھی اور قائداعظم کے سونے کے کمرے کے سامنے میرا کمرہ تھا اس لئے کہ جب وہ گھنٹی بجائیں اور انہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو میں فوراً پہنچ جاؤں۔ سوال:۔ انہوں نے کوئی چیز طلب کی؟ جواب: اس اثنا میں انہوں نے کبھی پانی اور کبھی چائے مانگی۔ سوال: جب آپ ان کیلئے پانی چائے لے کر گئے وہ کیا کر رہ تھے؟ جواب: وہ بیٹھے خوب کام کر رہے تھے دن بھر کی مصروفیات کے باوجود انہوں نے آرام نہیں کیا۔ جب وہ کام کرتے کرتے تھک جاتے تو ادھر اُدھر جاتے۔ میں نے خود دیکھا انگیٹھی پر رحل میں قرآن پاک رکھا ہوا ہے اس پر ماتھا رکھ کر رو پڑتے تھے۔ س: قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں اور رو پڑتے ہیں۔ س: اس دوران کوئی دعا بھی مانگتے تھے؟ جواب: میری موجودگی میں نہیں۔ سوال: اس موقع پر ان کا لباس؟ جواب: شلوار اچکن۔ سوال: لیکن میں نے جو سنا ہے کہ رات گئے ان کے کمرے سے ٹھک ٹھک کی آواز آئی۔ شبہ ہوا کوئی سرخ پوش نہ کمرے میں گھس آیا ہو؟ جواب: اسی رات۔ آدھی رات کا وقت تھا ہر کوئی گہری نیند سو رہا تھا۔ ڈیوٹی پر موجود پولیس اپنا فرض ادا کر رہی تھی کہ اچانک ٹھک ٹھک کی آواز گورنمنٹ ہاؤس کا سناٹا چیرنے لگی۔ آواز میں تسلسل اور ٹھہراؤ تھا۔ میں فوراً چوکس ہو گیا۔ یہ آواز قائداعظم کے کمرے سے آ رہی تھی۔ ہمیں خیال آیا کہ شاید اندر کوئی چور گھس گیا ہے۔ ڈیوٹی پر موجود پولیس افسر ادھر آ گئے۔ پولیس ادھر اُدھر گھوم رہی تھی کہ اندر کس طرح جھانکا جائے؟ ایک ہلکی سی در شیشے پر سے پردہ سرکنے سے پیدا ہو چکی تھی اس سے اندر کی مومنٹ دیکھی جا سکتی تھی۔ ہم کیا دیکھتے ہیں کہ '' قائداعظم انگیٹھی پر رکھے ہوئے قرآن حکیم پر سر جھکائے کھڑے ہیں چہرہ آنسوؤں سے تر ہے تھوڑی دیر بعد وہ کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیتے ہیں پھر قرآن حکیم کی طرف آتے ہیں اس کی کسی آیت کا مطالعہ کرنے کے بعد پھر چلنے لگتے ہیں۔ جب ان کے پاؤں لکڑی کے فرش پر پڑتے ہیں تو وہ آواز پیدا ہوتی ہے جس نے ہمیں پریشان کر رکھا تھا۔ آیت پڑھ کر ٹہلنا یعنی وہ غور کر رہے تھے کہ قرآن کیا کہتا ہے اس دوران میں وہ کوئی دعا بھی مانگ رہے تھے (صفحات 239-40)

اس واقعے سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ قائداعظم سچے اور کھرے انسان تھے۔ قرآن مجید سے نشان زدہ صفحہ نکالنا اسے پڑھنا غور کرنا اور معنی سمجھ کر رونا ان کے سچے مسلمان ہونے کی نشانی ہے۔

جناب شریف الدین پیرزادہ کئی برس قائداعظم کے سیکرٹری رہے۔ انہوں نے ایک انٹرویو میں بتایا '' قائداعظم کے پاس قرآن حکیم کے چند ایک عمدہ نسخے تھے ان میں کچھ قلمی بھی تھے ایک بہترین نسخہ ان کے بیڈ روم میں احتراماً جزدان میں اونچی جگہ رکھا رہتا تھا میں نے انہیں محمد مار ماڈیوک پکھتال کا قرآن حکیم کا انگریزی ترجمہ پڑھتے دیکھا۔ جو بعد ازاں مسلمان ہو گیا (بحوالہ قائداعظم اور قرآن فہمی محمد حنیف شاہد صفحہ ۷۳)

مولانا غلام رشید جو قیام پاکستان سے قبل بادشاہی مسجد کے خطیب رہے۔ جو مفسر اور شارح قرآن تھے۔ انہیں قائداعظم نے طلب فرمایا وہ مسلم لیگ کے ارکان کیساتھ ''ممدوٹ ولا'' لاہور میں قیام پذیر تھے۔ انہیں افتتاحیہ خطبہ تیار کرنے کیلئے کہا اور فرمایا..... ''چند نکتے ذہن میں رکھو۔ ان کے سامنے میز پر قرآن کریم کا انگریزی ترجمہ رکھا تھا اسے ہاتھ میں لے کر فرمایا اس حقیقت پر ایمان ہے کہ اس کتاب عظیم میں دنیا اور آخرت کی زندگیوں کے متعلق ضابطے اور آئین موجود ہے قرآن حکیم میں کہا گیا ہے کہ جرم کی سزا جرم کی نوعیت کے مطابق دی جائے۔ اس پر میں نے انہیں کہا آپ کے ذہن میں غالباً قرآن کریم کی وہ آیت ہے (ترجمہ! جن لوگوں نے برائیاں کمائیں تو برائی کا بدلہ تو اسی جیسا ہوتا ہے (سورۃ یونس (10/27)۔ اس پر انہوں نے قرآن کریم کھولا اور اس آیت کو دیکھ کر فرمایا بے شک میرے ذہن میں یہی آیت تھی اس کے بعد کہا دیکھو بے شک یہ اصولی اور ابدی حکم ہے۔ یہ دیکھنا اسلامی مملکت کا کام ہوگا کہ وہ معاشرہ کے حالات کی روشنی میں کس جرم کی سزا کتنی ہونی چاہیے جو قرآن کریم کے اصولوں کے مطابق ہو۔

بفضل تعالیٰ قائداعظم کو عنداللہ و عندالرسول اور عندالناس یہ مقامات

عالیہ حاصل تھے مذکورہ بالا صفات کی بناء پر قرآن حکیم کی روشنی میں قائداعظم مومن اعظم تھے جنہیں کانگریس کے ایجنٹ کافر اعظم کہتے نہ تھکتے تھے۔

جب مولا پاک نے جہاد پاکستان کی کمان اس نحیف و ناتواں بوڑھے جرنیل کے ہاتھ میں دی تو اس نے اسے اس جہاد میں کامیابی و کامرانی حاصل کرنے کیلئے یہ غیبی امداد بخشی کہ اس کے نطق کو اثر و تاثیر دی اسے خوداعتمادی اور خدااعتمادی کا مجسمہ بنا دیا۔ اس کے عزم وارادہ میں نو کروڑ مسلمانوں کی تاب و طاقت رکھ دی۔ مسلمانوں کے دشمنوں اور مخالفوں کے دلوں پر اس کا رعب اور ہیبت بٹھا دی۔ اس کی تائید و اعانت کیلئے حجروں اور خانقاہوں کے گوشہ نشین، علماء ربانی اور مشائخ روحانی کی جماعت میدان عمل میں بھیج دی۔

قائداعظم کے معالج خصوصی ان کی زندگی کے آخری لمحات کی بات اس طرح بیان کرتے ہیں۔

''گیارہ ستمبر کو ہم کوئٹہ سے بذریعہ ہوائی جہاز کراچی روانہ ہوئے۔ قائداعظم بہت کمزور ہو چکے تھے لیکن بفضل خدا راستے میں طبیعت درست رہی۔ سفر کے دوران کوئی تکلیف محسوس نہ ہوئی۔ کراچی پہنچنے پر محترمہ فاطمہ جناح نے فرمایا قائداعظم کی طبیعت قدرے درست ہے اب آپ جا کر آرام کریں اور شام کو حسب معمول چلے آئیں۔ لیفٹیننٹ کرنل الٰہی بخش ہوٹل چلے گئے اور میں لیفٹیننٹ کرنل مظہر حسین شاہ کے ہاں چلا گیا۔ کھانے پر بیٹھے ہوئے تھے کہ نو بجے کے قریب فون آیا کمزوری زیادہ ہوگئی ہے بے قراری بڑھ رہی ہے آپ فوراً پہنچئے چنانچہ ہم ایک ہی وقت میں گورنمنٹ ہاؤس پہنچے۔ ڈاکٹر بھی آ گئے ہم نے قائداعظم کا معائنہ کیا۔ میں نے ٹیکہ لگایا آپ پر اس وقت بے ہوشی طاری تھی، نبض کی رفتار بھی غیر مسلسل تھی قدرے حالت سنبھلی، چندمنٹ تک حالت اچھی رہی پھر دل ڈولنے لگا نبض پھر غیر مسلسل ہوگئی آنکھیں پتھرانے لگیں سانس رک رک کر آنے لگی اور بے ہوشی کے عالم میں آپ نے فرمایا اللہ...... پاکستان! (کتاب زندہ قائداعظم صفحہ ۱۲۹)

اب عارف باللہ حضرت قائداعظم کے آخری لمحات کی بات...... اس عظیم مومن کی عظیم بہن محترمہ فاطمہ جناح کی زبانی۔

''وہ کسی خلل کے بغیر تقریباً دو گھنٹے تک سوتے رہے پھر انہوں نے آنکھیں کھولیں مجھے دیکھا اور سر اور آنکھوں کے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا انہوں نے بات کرنے کی آخری کوشش کی اور سرگوشی کے انداز میں کہنے لگے ''فاطی خدا حافظ، لا الہ الا اللہ...... محمد الرسول اللہ...... ان کا سر آہستگی سے قدرے دائیں جانب کو ڈھلک گیا...... ان کی آنکھیں بند ہوگئیں۔''

بالآخر لوگ چندمنٹ میں پہنچ گئے اور انہوں نے ان کا معائنہ کرنا اور انجکشن دینا شروع کر دیئے میں وہاں خاموش اور بے حس وحرکت کھڑی رہی اور پھر میں نے دیکھا کہ انہوں نے ان کا پورا جسم سر سے پاؤں تک ایک سفید چادر سے ڈھانپ دیا۔ میں جانتی تھی اس کا مطلب کیا ہے۔ موت انہیں اس زندگی سے دوسری زندگی میں لے جانے کیلئے آ چکی تھی۔

اتر کر جہانِ مکافات میں
رہی زندگی موت کی گھات میں

(کتاب زندہ قائداعظم صفحہ ۱۲۹)

جناب اسد ملتانی نے حضرت قائداعظم کی تدفین کا حال کچھ اس طرح منشی صاحب کو لکھا ہے جس سے ان کے عارف کامل ہونے کی مزید تصدیق ہوگئی۔ وہ بابائے قوم جو زندگی کی تمام توانائیوں کے ساتھ اپنی کمائی کے کروڑوں روپے نچھاور کر دینے والے دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کے بانی کی یہ تکفین سینکڑوں اشخاص نے بچشم نم اور روتے ہوئے دیکھی وہ خط میں لکھتے ہیں۔

''قائداعظم کی وفات کے سلسلے میں ایک خاص بات جو غالباً اخبارات میں نہ نکلی ہوگی یہ تھی کہ ان کیلئے کوئی خاص تابوت نہیں بنوایا گیا بلکہ قریب کی مسجد سے ایک عام تابوت منگوایا گیا۔ اس میں معمولی کھجور کے پتوں والی چٹائی بچھائی گئی تھی کفن کیلئے بھی بالکل معمولی لٹھا ڈپو سے منگوایا گیا تابوت پر محض پاکستانی جھنڈا ڈالا گیا اور دیگر کسی قسم کی قیمتی چادر نہیں ڈالی گئی۔ جھنڈے کے اوپر سر کی جانب تھوڑے سے پھول رکھے ہوئے تھے البتہ قبر پر پھولوں کے انبار لگ گئے۔ روزانہ پھول ہٹائے جاتے ہیں اور نئے پھولوں کا انبار لگ جاتا ہے ابھی تک دن رات قرآن خوانی کا سلسلہ

جاری ہے اور لوگوں کا ہجوم رہتا ہے اس مردِ خدا نے عجیب موت پائی ہے۔''

قائداعظم نے دنیا کی تاریخ میں ایسا مقام حاصل کیا جو آج تک کسی اور لیڈر کو نصیب نہیں ہوا۔ جیا تو شہنشاہوں کے سے وقار سے جیا بعد وفات درویشان خدا مست نے تکفین و تدفین کی اور نماز جنازہ شیخ الاسلام حضرت شبیر احمد عثمانی نے پڑھائی۔ بزرگ فرماتے ہیں بعض ہستیاں ایسی ہوتی ہیں ان کی نماز جنازہ پڑھنے والے لوگ بھی بخش دیئے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ میت کسی اللہ کے پیارے کی ہوتی ہے اور اس کا نماز جنازہ پڑھانے والا بھی اللہ کا ولی ہوتا ہے اور آسمان سے فرشتوں کی قطاریں بھی شمولیت کیلئے پہنچتی ہیں۔ اس کی تصدیق یوں بھی ہوتی ہے کہ نماز جنازہ کے وقت ظفر اللہ قادیانی ایک طرف ہٹ کر دور چلا گیا اور زمین پر بیٹھ گیا جبکہ حالت اضطرار میں پارسی اور عیسائی تک پارسی اور عیسائی تک نمازِ جنازہ میں لاکھوں مسلمانوں کے ساتھ صف میں کھڑے ہوگئے یہ ایسا نظارہ تھا جسے چشم فلک نے کم ہی دیکھا ہوگا۔

اس کے علاوہ ایک حیرت انگیز بات...... جب حضرت قائداعظم کے جنازے کا جلوس ان کی آخری آرام گاہ کی طرف رواں تھا تو ان لاکھوں انسانوں کے سمندر میں تقریباً ہر شخص نے یہ محسوس کیا کہ مغرب کی طرف سے وقفے وقفے سے عطر بیز ہوا اس طرح سے چل رہی ہے کہ گویا کہ جلوس میں شامل ہو۔ ہوا میں تازہ گلاب کی پتیوں کی سی خوشبو تھی اور یہ خوشبو آخری وقت تک قائم رہی۔ حتیٰ کہ جب لوگ بعد دفن دعا آزردہ خاطر گھروں کو واپس ہوئے۔ یہ خوشبو جنازہ میں شامل ہر فرد نے بار بار محسوس کی اور لوگوں میں مدتوں اس خوشبو کا چرچا رہا۔

منشی صاحب کتاب ''مذہب وعقیدہ'' کے صفحہ 82-81 میں رقمطراز ہیں۔ روحانی دنیا کے مطابق عارف کی تدوین ابدال کے ذمے ہوتی ہے۔ جس وقت آپ کی وفات کی خبر آپ کے روحانی مربی یعنی اس غازی مرد کو ''محمدی'' جہاز میں ملی اس وقت وہ قائداعظم ہی کے ایک مشن پر سوئے حجاز روانہ ہونے کیلئے جہاز پر سوار ہو چکے تھے۔ ان کی وفات کی خبر سن کر جہاز سے اتر کر بندرگاہ سے باہر آئے۔ جنازے میں شرکت کی اور تن تنہا قائداعظم کے جسدِ خاکی کو علامہ شبیر احمد عثمانی، سردار عبدالرب نشتر اور خواجہ ناظم الدین وغیرہ کی موجودگی میں لحد میں اتارا۔

جیسا کہ قرآن پاک کی سورۃ الفجر میں آتا ہے۔

''اے نفس مطمئنہ! آجا اپنے رب کے پاس اس حال میں کہ تو اپنے نیک انجام سے خوش اور اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ ہے شامل ہو جا میرے نیک بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں۔ (آیت 27 تا 30)

استفادہ:۔ قائداعظم کی شخصیت کا روحانی پہلو از ملک حبیب اللہ روزنامہ جنگ کالم ''صبح بخیر'' از ڈاکٹر صفدر محمود (مسجد) (قائداعظم کی قرآن فہمی) (قائداعظم اور مولانا اشرف علی تھانوی) قائداعظم کیا چاہتے تھے؟) ادھورے سچ)

☆......☆......☆

# غزل

دہکتی خواہشوں میں جل رہا ہوں
کبھی قاتل کبھی مقتل رہا ہوں

رہا ہوں واقفِ رازِ حقیقت
بظاہر بے خبر پاگل رہا ہوں

مرا پیچھا نہ کر اے زندگانی
میں راہِ رفتگاں پر چل رہا ہوں

میں ایسا اژدہا ہوں خواہشوں کا
خود اپنا خون پی کر پل رہا ہوں

ہوا پورا نہ تیرا کل کا وعدہ
میں جس کے واسطے بے کل رہا ہوں

گواہی کے لیے کافی رہے گا
میں اپنا خون منہ پہ مل رہا ہوں

ردائے تشنگی اوڑھے ہوئے ہوں
سمندر کے کنارے چل رہا ہوں

مسلسل اشک جاری ہیں کرامتؔ
کسی کی یاد میں جل تھل رہا ہوں

کرامت بخاری

ام ایمان

# وقت کا پہیہ

سقوطِ ڈھاکہ کے دنوں کی دلخراش داستان! جئے بنگلہ کے بعد جئے مہاجر کا نعرہ لگانے والوں نے تاریخ سے کوئی سبق نہیں سیکھا

حسن نے ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھا۔ تالاب کے گدلے اور سبز پانی کے پارکیوں اور ناریل کے گھنے جھنڈ میں اس کی روشنی آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی۔ حسن کو سارے درخت کچے پکے مکان اور تالاب کا پانی سب کے سب سیاہ رنگ میں رنگتے نظر آ رہے تھے۔ سارے رنگ ختم ہو گئے...... زندگی سے بھرے شوخ رنگ...... بس غم اور جدائی کا رنگ سب پر غالب آ گیا۔

''شاید اس سوہنے دیس کا آخری سورج میں نے دیکھا ہے۔ ہاں شاید......نہیں بلکہ یقیناً'' حسن نے خود ہی اپنی تصحیح کی۔

کل رات ابا کو بڑی کوششوں سے جہاز کے ٹکٹ ملے تھے۔ آج صبح سیٹوں کے بارے میں پکی اطلاع مل گئی تھی۔ رات سے سب ہی جانے کی تیاریوں میں لگے تھے۔ لیکن یوں دسیوں سال رہنے بسنے کے بعد اس طرح دنوں میں جانے کی تیاری کی جا سکتی ہے؟ سب سے پہلے تو اماں اس گھر کو چھوڑنے اور بیچنے پر راضی نہیں تھیں۔ اس قدر آرزوؤں کے ساتھ تو گھر بنایا تھا۔ اس کی ایک ایک اینٹ اور محراب میں اُن کے خواب گندھے تھے۔

''نہیں شفیق! میرا دل راضی نہیں ہوتا''

ابا کے ہر دفعہ کے سمجھانے کے بعد اماں کی ایک یہ ہی دلیل ہوتی۔ پھر اماں کو ابا کے اوپر اعتماد بھی تو نہ تھا۔ گھر بیچ دوں تو سر کے اوپر سے چھت بھی جائے گی۔

''ارے بھولی بی بی! سر رہے گا تو چھت میسر آ ہی جائے گی ورنہ اسی چھت کے نیچے سارے خاندان کی قبر بنے گی۔''

ابا سمجھاتے ''حالات خراب ہیں۔ جب سے انتخابات ہوئے ہیں پتہ پتہ دشمن کی طرح لگ رہا ہے۔ ہواؤں میں خون کی بو رچی بسی محسوس ہو رہی ہے۔ نیک بخت تمہیں اپنی اور اپنے بچوں کی زندگی عزیز ہے یا اس گھر کے در و دیوار؟''

''کچھ نہیں ہو گا حسن کے ابا...... یہ دیکھو ہمارے پیچھے ڈولی روبی کی اماں کا گھر ہے...... میری سہیلی! برابر میں راجو کا خاندان رہتا ہے۔ سامنے رجب علی ماسٹر جی کا گھر ہے اتنا اچھا محلّہ اتنے محبت کرنے والے لوگ کیا ہم کو یوں ہی مرنے کے لیے چھوڑ دیں گے؟''

''جب اپنی جان پر بن آتی ہے نا تو کوئی کسی کا خیال نہیں کرتا۔ سب سے پہلے اپنا خاندان اپنے بچے اور اپنی جان۔ محمد پور اور میر پور میں جو قیامت گزر رہی ہے تمہیں خبر بھی ہے اب یہ لاوا کسی وقت بھی یہاں پھوٹ سکتا ہے۔ قسمت اچھی ہے ٹکٹ ہاتھ آ گئے ہیں ورنہ لوگ ائرپورٹ پر دن رات پڑے ہیں کہ ٹکٹ ملے اور نکل جائیں۔ ناشکری نہ کرو بس جانے کے لیے سامان سمیٹ لو لیکن تین بکسوں سے زیادہ نہ ہو۔ باقی سب بیچ دینا ہی اچھا ہے۔ زندگی رہی تو سامان بھی بہت اور گھر گھروندے بھی بہت۔''

تین بکسے!!!

اماں نے ایک نظر گھر کے سامان پر ڈالی۔ چھتوں کو چھوتی ہوئی الماریاں جن کے دروازوں پر پورا پورا آئینہ لگا تھا۔ شیشم کی لکڑی کے مضبوط، پھول پتی سے سجے سرہانے والے پلنگ، پلنگوں کے نیچے اٹا کٹ بھرے بکسے!!

دور کہیں فائرنگ کی آوازیں بلند ہوئیں۔

''حسن ریڈیو لگاؤ'' ابا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

حسن نے میز پر پڑا ریڈیو لگایا تو خبریں ہی آ رہی تھیں۔

''صدر یحییٰ خان نے ۳ / مارچ ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ میں قومی اسمبلی کا طلب کردہ اجلاس مسٹر بھٹو کے شرکت سے انکار پر دو دن پہلے ملتوی کر دیا ہے۔ اجلاس کے التوا پر عوامی لیگ کے سربراہ شیخ مجیب الرحمان نے اس

کو گہری سازش قرار دیا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ یہ اجلاس محض ایک اقلیتی پارٹی کے جذبات کے تحت ملتوی کیا گیا ہے، ہم اس پر خاموش نہیں بیٹھیں گے۔''

''قومی اسمبلی کا اجلاس مسٹر بھٹو کے مطالبہ پر ہی طلب کیا گیا تھا لیکن حیرت انگیز طور پر مسٹر بھٹو نے ڈھاکہ میں طلب کیے گئے اجلاس میں شرکت سے نہ صرف انکار کیا بلکہ دیگر ارکان اسمبلی کو بھی دھمکایا ہے۔'' خبروں کے بعد حالات پر تبصرہ آ رہا تھا۔

''حالات اب مزید خرابی کا رُخ اختیار کر رہے ہیں۔'' یہ تبصرہ ابا کا تھا۔

واقعی اعلان التوا کے بعد عوام نفرت اور غصے سے کھول اٹھے اور بپھرے ہوئے ہجوم لوہے کی سلاخوں اور بانس کی لاٹھیوں سے مسلح ہو کر سڑکوں پر نکل آئے۔ قومی اسمبلی کے اجلاس کی منسوخ کردہ تاریخ پر ہڑتال کی کال دے دی گئی۔ اسی دن شیخ مجیب الرحمان نے ایک احتجاجی جلسے میں شرکت کی اور ان کی موجودگی میں سرزمین پاکستان پر پہلی مرتبہ بنگلہ دیش کا جھنڈا لہرایا گیا، پاکستان کا جھنڈا نذرِ آتش کیا گیا۔ پاکستان کے قومی ترانے کو چھوڑ کر رابندر ناتھ ٹیگور کی ایک نظم کو قومی ترانے کے طور پر گایا گیا۔

وقت تیزی سے ہاتھ سے نکل رہا تھا۔

ابا نے اونے پونے مکان کا سودا کر دیا تھا۔ یہ سودا گھر کے ساتھ گھر کے سامان کا بھی تھا۔ اماں نے بہتی آنکھوں اور لرزتے کانپتے ہاتھوں سے تین بکسے تیار کر ہی لیے تھے۔ آخر ان کو حالات کا ادراک ہو ہی گیا تھا۔ آخر کیوں نہ ہوتا جب ایک دن اپنے ہی تالاب کو بے گناہ بہاریوں کے خون سے رنگین ہوتا اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

مون سون کی بارشوں میں یہ تالاب خوب وسعت اختیار کر جاتا اور پھیل کر گھر کی سیڑھیوں تک پہنچ جاتا۔ حسن حفصہ اور چھوٹا منا سکول جانے کے لیے چھوٹی کشتیوں پر سوار ہو کر پار لگتے اور پھر خشکی پر اتر کر سکول جاتے۔ عام لوگوں کے جانے آنے کے لیے بانسوں کو گاڑ کر اوپر نیچے ایک ایک متوازی بانس باندھ کر راستہ بنا دیا جاتا۔

حسن کی تو اس تالاب سے بے شمار یادیں وابستہ تھیں۔ یہیں اُس نے تیرنا سیکھا تھا۔ سارے دوست مل کر فٹ بال کھیلتے جو اکثر تالاب میں جا گرتی اور باری باری اُس کو لانے کی ذمہ داری سب کے سر جاتی لیکن حسن ہمیشہ طرح دے جاتا کہ مجھے تیرنا نہیں آتا۔ ایک دن جب سب دوست تالاب میں کشتی چلا رہے تھے تو جب کشتی عین تالاب کے وسط میں پہنچی تو سارے دوست چھلانگ مار کر کشتی سے پانی میں آ گئے اور ابھی حسن اُن کو حیرت سے دیکھ ہی رہا تھا کہ سب نے مل کر کشتی الٹ دی۔ حسن نے پانی میں غوطہ کھایا۔ پہلے تو پانی ناک منہ میں چلا گیا پھر الٹے سیدھے ہاتھ چلا کر تیرنا شروع کیا اور کنارے پر پہنچ گیا۔

کنارے پر سارے دوست پہلے سے موجود تھے جنھوں نے تالیاں بجا کر اس کا استقبال کیا۔ حسن سارے دوستوں سے خفا تھا لیکن سب نے اُس کی خفگی کی پروا نہ کی اور اپنے لطیفوں سے اُسے ہنسا کر ہی دم لیا۔ اچھا یہ ہوا کہ حسن کا پانی سے خوف چلا گیا۔ اب وہ مزے سے پورے تالاب میں بطخ کی طرح تیرتا پھرتا تھا۔

تالاب میں رہنے والے راج ہنس کے جوڑوں کو تو ستانے میں اُسے خاص لطف آتا۔ ایک دفعہ جب وہ چپکے سے اُن کے انڈے اٹھا کر گھر آ رہا تھا تو مادہ راج ہنس اس کے پیچھے پڑ گئی، دوڑا دوڑا کر اس کو پسینہ پسینہ کر دیا۔ وہ تو لاٹھی اٹھا کر آنے والے چچا رجب علی نے ایک دو لاٹھیاں زمین پر زور سے ماریں تو اُس نے پیچھا چھوڑا۔

اکثر بنگالی بیڑے کے گھروں میں رہتے تھے جہاں غسل خانے نہیں ہوتے۔ وہ نہانے دھونے کا سارا کام اسی تالاب کے کنارے کرتے تھے۔ بنگالی عورتیں اپنی ساڑیاں دھونے نہانے اور بدلنے کا کام کرتیں تو حسن کمرے کی کھڑکی سے چپکے چپکے نظارہ کرتا۔ اگرچہ اتنی دوری سے نظر کیا خاک آتا لیکن حسن بعد میں خود ہی شرمندہ شرمندہ رہتا۔ برائی میں مزہ تو ہے لیکن بعد کی چبھن اور خلش ہر دفعہ یاد آنے پر نئے انداز سے دل کو زخمی کرتی ہے۔

یہیں تالاب کے کنارے حسن نے اپنے بنگالی دوستوں سے پتنگ اڑانا سیکھا تھا جس سے ابا کو سخت نفرت تھی۔ ایک دو دفعہ جب آتے جاتے ابا نے حسن کو پتنگ اڑانے پر منع کیا اور ساتھ ہی تھپڑ سے تواضع کی تو حسن نے پتنگ اڑانے کے لیے گھر کی چھت منتخب کر لی کہ نہ ابا کی نظر پڑے گی نہ مار پڑے گی۔ واقعی چھت پر پتنگ اڑانے کا اپنا ہی مزہ ہوتا ہے اور اتنا مزہ آتا ہے کہ وقت کا اندازہ ہی نہیں ہوتا اور ایک دن حسن

صاحب چھت پر چڑھے تو دوپہر گزر گئی۔ اماں کھانے کے لیے آوازیں دیتی رہ گئیں۔ شام ہوگئی یہاں تک کہ ابا آ گئے۔ ابا کا تو آتے ہی سوال ہوتا تھا کہ حسن کہاں ہے۔

اماں تو پہلے ہی حسن پر ناراض تھیں سو ابا سے شکایت کردی کہ آپ کا لاڈلا صبح سے چھت پر چڑھا پتنگ اڑا رہا ہے دوپہر میں کھانے کے لیے بھی نہیں اترا۔ ابا نے غصے میں گرجدار آواز دی۔

حسن میاں کی حالت خراب، نیچے اترے نہیں کہ آج خیر نہیں لیکن اترنا بھی ضروری لہٰذا اترے نیچے ابا پائپ لیے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ وہ تو دادی نے ابا کا ہاتھ پکڑ لیا ورنہ آج حسن کی کھال ہی اتر جاتی۔

بچپن کے سنہرے رو پہلے دنوں کا رومانس جس تالاب کی بہت سی خوبصورت یادوں سے سجا تھا اسی تالاب کے کنارے پرسوں اس نے وہ خونی منظر دیکھا تھا۔ جو شاید کبھی بھی اُس کے حافظے سے محو نہیں ہوسکتا تھا۔

وہ کچھ بہاری لڑکیاں تھیں جن کے کپڑے پھٹے اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ دس بارہ بنگالی ادھیڑ عمر اور جوان مرد انہیں بکریوں کی طرح ہنکاتے اسی تالاب کے کنارے لے آئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں خنجر اور تلواریں چمک رہی تھیں جب پہلی لڑکی کو گرا کر ایک مرد نے اس کے گلے پر خنجر پھیرا تو اماں نے جلدی سے سارے بچوں کو کھڑکیوں سے ہٹا کر مسہری کے پیچھے چھپادیا۔

اماں بہت دیر پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں وہیں چھپا کر دیکھتی رہیں اور پھر فوراً ہی حالات کی سنگینی کا انہیں ادراک ہوگیا۔

''مسلمان لڑکیوں کو اس طرح بے آبرو کر کے قتل کرنے والے مسلمان نہیں؟؟'' اماں بار بار ابا سے یہی بات پوچھے جاتیں۔

''تعصب کی آگ انسان کے حواس کھو دیتی ہے میمونہ! تعصب کی پٹی جب آنکھوں پر بندھ جاتی ہے تو وہ اپنے ہی بازوؤں کو غیر سمجھ کر کاٹتا ہے اور اُس کو احساس تک نہیں ہوتا۔ ان غیر بنگالی مسلمانوں کو قتل کرنے اور اُن کی عورتوں کو بے آبرو کرنے ان کے مال و اسباب کو لوٹنے والے بنگالی نسل پرستوں اور سوشلسٹ مسلمانوں کے دوش بدوش ہندو بھی شریک ہیں۔ بلکہ وہ ہی انہیں بھڑ کا کر اپنا کام نکلوا رہے ہیں۔ شاید کبھی دنیا میں ایسی صورت پیش نہ آئی ہو کہ کافروں کے ساتھ مل کر مسلمانوں نے مسلمانوں کو مارا ہو اور اُن کی بے حرمتی کی ہو لیکن ان قوم پرست اور سوشلسٹ لوگوں نے جن کے صرف نام مسلمانوں جیسے ہیں یہ کریہہ عمل بھی ایک کارنامے کی طرح انجام دے ڈالا ہے۔ یہ سب مکتی باہنی کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔'' حالات کا چہرہ مزید بھیانک ہوتا جا رہا تھا۔

ابو کے ہاتھ میں ٹکٹ آ گئے تو جیسے انہوں نے اطمینان کا سانس لیا لیکن ابھی ائر پورٹ تک پہنچنا بھی ایک مرحلہ تھا۔ حالات ایسے تھے کہ ابا کو کسی پر بھروسہ نہ تھا۔ سب کو منع کر دیا گیا تھا کہ جانے کے بارے میں کسی کو نہ بتائیں کب نکلنا ہے۔ پرسوں رات کی فلائیٹ تھی ابا نے صبح صبح ہی نکل جانے کا فیصلہ کیا کہ شر پسند رات گئے تک کارروائیوں کے بعد صبح لمبی تان کر سوتے ہیں۔

رجب علی اور شبیر خان کو بھی ہوا نہ لگنے دی کہ کب نکلنا ہے۔ جب بھی بات ہوتی تو ابا یہ ہی کہتے دیکھو بھائی شاید ایک آدھ ہفتہ میں نکلنے کی کوئی سبیل بن سکے۔

چھت پر لگے بانس پر جھنڈا تبدیل کرنے کی ذمہ داری حسن کی ہی تھی جس کو وہ وقت کے لحاظ سے بخوبی نباہ رہا تھا۔ جوں ہی شیخ مجیب کی طرف سے ہڑتال یا احتجاجی جلسہ کی کال ہوتی بانس پر بنگلہ دیش کا جھنڈا لہرانے لگتا۔ پھر جب افواج پاکستان کی آمد کی اطلاع ملتی جھنڈا تبدیل ہوجاتا اور سبز ہلالی پھریرا لہرانے لگتا۔

جھنڈا بدلنے کی سیاست پر تو پورا محلّہ ہی کاربند تھا۔ آخر عزت و آبرو اور جان و مال کسے پیارا نہیں ہوتا لیکن حالات اب اس قدر خراب ہوگئے تھے کہ یہ حل بھی کارگر نہیں رہا تھا۔

ابا نے اپنے کسی بنگالی دوست کو ایئر پورٹ تک پہنچانے کے لیے بلایا تھا۔ سو یہ مرحلہ طے ہو ہی گیا۔ کراچی اتر کر سب نے شکرانے کے نفل ادا کیے کہ عزت و جان کی حفاظت سے خدا نے پہنچا دیا۔ ایئر پورٹ کے باہر دینی تنظیموں کے کیمپ لگے تھے۔ آنے والوں کو گھریلو سامان کے پیکٹ دیے جا رہے تھے۔ ابا کا ارادہ تو لائن میں لگنے کا تھا لیکن اماں نے سختی سے منع کیا۔

''اللہ نے زندگی بچائی ہے وہ ہی مسبب الاسباب ہے۔''

واقعی انسان تو صرف سوچ سکتا ہے اور ارادہ کر سکتا ہے کام کرالینا

تو اللہ ہی کا کام ہے،اور اللہ اپنا کام کرالیتا ہے سو کرالیا۔

آج اتنا عرصہ ہو گیا کہ ماہ سال کی گنتی بھی یاد نہیں حسن نے ذہن پر زور دیا۔

''وقت کا دریا تین عشروں سے زیادہ طویل فاصلہ طے کر چکا ہے اب تو میرا چھوٹا بیٹا بھی سمجھ دار ہو گیا ہے۔''اس نے سوچا۔

دروازہ زور سے کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز آئی۔حسن چونک کر اپنی سوچوں سے باہر آیا۔

''ابو جیئے مہاجر...... لے کر رہیں گے حق اپنا'' نجم نے گھر میں داخل ہوتے ہی زور سے نعرہ لگایا۔

''وعلیکم السلام''حسن نے بیٹے کو شرمندہ کرنا چاہا۔

''ہاں ابو! السلام علیکم لیکن اب ہمارا حق ہم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔''

نجم نے بغیر شرمندہ ہوئے دوبارہ پورے جوش سے نعرہ لگایا۔

حسن کو جوش سے تمتماتے چہروں کے ساتھ نعرے لگاتے بنگالی نوجوان یاد آ گئے''جیئے بانگلہ''

نہ نظریات بدلے ہیں نہ سوچیں اور نہ ہی سبق سیکھا گیا ہے۔ تعصب کی آگ پھر بھڑکائی جا رہی ہے۔ پتہ نہیں اب کے اس آگ سے ہاتھ کون تاپنا چاہتا ہے؟حسن نے سوچا۔

کیا خوابوں کی تعبیر ہمیشہ ہی اُلٹی نکلتی ہے؟

●......●......●

شاہدہ اکرام

# جذبوں کا سفر

''ابا! چلو گھومنے چلیں؟ دل گھبراتا ہے......ابا تم بولتے نہیں ہو؟ یہ کون لوگ تھے؟ کیوں آئے تھے؟ جب سے وہ تم سے مل کر گئے ہیں تم چپ چپ ہو گئے ہو۔ تمھاری آنکھوں سے پانی کیوں بہہ رہا ہے؟ باپو بولو نا۔ کیوں نہیں بولتے؟''

چھ سالہ خانو اپنے باپ کا بازو ہلا ہلا کر سوال کیے جا رہا تھا۔ اور باپ تھا کہ دور نگاہیں جمائے گم سم بیٹھا تھا۔ خانو غور سے اس کے چہرے کو تک رہا تھا۔ اپنے باپ کو اداس تو وہ اکثر دیکھتا تھا۔ لیکن آج تو رنگ اور ہی تھا۔ کبھی اس کا چہرہ زرد پڑ جاتا اور کبھی یکدم سرخ ہو جاتا۔ اور وہ بڑبڑانے لگتا۔ میں ضرور تمھارے پاس آؤں گا۔ تم مجھ سے ملو گے۔ ہم سب ملیں گے۔ پورب پچّھم ایک ہوں گے، ملاپ ہوگا......کتنا حسین ہوگا وہ دن......اور وہ دن دور نہیں...... جو بڑبڑاتے ہوئے یکدم خاموش ہو گیا۔ خانو ابھی تک اس کا بازو ہلا رہا تھا۔

باپو چل گھاٹ پر چلیں۔ آج تو کچھ کھایا بھی نہیں۔ بھوک لگی ہے۔ چل مچھلی پکڑ کر لاتے ہیں۔ خانو نے جونہی باپ کو اپنی طرف متوجہ دیکھا جھٹ بھوک مٹانے کا سوال کر ڈالا۔

''ہاں بیٹا چل۔'' بے خودی میں ہی وہ گھر سے نکل پڑا۔

''باپو تم آج مجھے کہاں لے آئے ہو......ہم پہلے تو ادھر جاتے تھے ادھر۔''

ننھے خانو نے ہاتھ سے گھاٹ کے دائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا؟ تبھی خانو نے دیکھا کہ وہ جنھیں اس نے صبح اپنے گھر میں باپو سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔ وہ بھی سوچوں میں گم اُنھیں کی جانب چلے آ رہے ہیں اور پھر...... پھر...... چار اور ایک بچہ پانی کو گھورنے لگے۔ بات ہی کچھ ایسی تھی جو انگلی اٹھائے ایک خاص سمت اشارہ کیے کھڑا تھا۔ وہ کچھ بول رہا تھا۔ ''دیکھو! دیکھو! دیکھ رہے ہو نا! اس نے دوسرا ہاتھ آنے والوں میں سے ایک کے کندھے پر رکھ دیا۔ یہ سرخ لکیر نظر آ رہی ہے ناں تمھیں یہ سرخ لکیر ایک بہت بڑے عہد کی امین ہے۔ سنو! یہ خون اور پانی کا ملاپ تھا۔ یہ سرخی آوازیں دیتی ہے۔ تم بھی اس عہد کو یاد رکھنا۔'' شاجو کا چھ سالہ بیٹا بڑے غور سے صاف شفاف پانی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ سرخ لکیر کو تلاش کر رہا تھا۔ اس نے خوف سے باپو کے چہرے کو دیکھا۔ کہیں میرا ابا پو...... پاگل......اس کی آنکھوں کے سامنے بستی کا وہ آدمی گھوم گیا جو زور زور سے بولتا ہوا گلیوں میں گزرتا تھا جس کے منہ سے جھاگ نکلتی تھی اس نے گردن اوپر اٹھا کر شاجو کے منہ کو غور سے دیکھا......نہیں میرا باپ تو بہت اچھا ہے۔ یہ تو پاگل نہیں ہے۔

''خانو بیٹے ادھر آؤ۔'' شاجو کا دوسرا ہاتھ خانو کے گرد تھا اس نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ آنے والوں کی طرف مڑا اور بات جاری رکھی۔ ''جس دیس سے آئے ہو وہ مجھے بڑا پیارا ہے۔ اسی دیس کی آن بان اور اتحاد کے لیے تو میرے بوڑھے باپ کا خون بہا تھا۔ اس کے دل میں اس پیارے منظر کو دیکھنے کی کتنی آرزو تھی میں بخوبی آگاہ ہوں۔ تم اپنے بڑوں سے میرے باپ کا ذکر سن کر آئے ہو نا۔ دیکھو اس گہرے پانی میں دیکھو تمھیں ملاپ کی حسین تصویر نظر آئے گی۔''

شاجو گہرے پانیوں میں کھو گیا تھا۔

''آؤ میں تمھیں بتاؤں کہ میرا باپ کس کی خاطر امر ہوا ہے؟''

۲۶ سال پہلے کشتی پانی کے بہاؤ پر چلی جا رہی تھی۔ شاجو اپنے بوڑھے اپ کے چہرے کو غور سے تک رہا تھا جو انتہائی سنجیدگی میں ڈوبا دور پانیوں میں گھور رہا تھا۔ اس نے باپ کی نگاہوں کا تعاقب کیا تو اس کی چیخ نکل گئی۔ چپو چلاتے ہاتھ کانپ کر رہ گئے۔ باپو...... باپو......ایک انجانا اندیشہ اس کے رگ و پے میں سرایت کر رہ گیا۔ پانی کے اوپر بنی

سرخ لکیر کو دیکھتے ہوئے اس نے بوڑھے باپ سے پوچھا۔ ''باپو...... باپو......'' چپو چھوڑ کر اس نے باپ کا کندھا ہلایا...... ''یہ خون کب تک بہے گا؟ یہ ختم کیسے ہوگا؟'' باپ خاموش رہا۔ بوڑھے کمزور ہاتھوں نے چپوؤں کو سہارا دیا اور کشتی کنارے کی طرف موڑ دی۔

باپو! میری بات کا جواب دو۔ گرم خون مصر تھا۔ ''زیادہ سوال مت کیا کر۔ کام کیا کر کام۔'' بوڑھے نے جال کو پیر سے دھکیلتے ہوئے کہا۔

کشتی کو منزل پر پہنچنے دو بتا دوں گا، سب بتا دوں گا۔ تو خود بھی تو جانتا ہے ناں! پتہ چل جائے گا، سب پتہ چل جائے گا۔'' شاجو کا بوڑھا باپ خود کلامی میں مبتلا تھا۔

''باپو! آج گہرے پانی میں شکار نہیں کرو گے؟'' شاجو کا ذہن کام کی طرف مڑ گیا۔

''نہیں، آج میں شکار نہیں کروں گا، پیٹ کی بھوک سے زیادہ محبت کی بھوک مجھے تڑپا رہی ہے۔ آج تو میں نے بڑی قیمتی چیز کو غاصبوں اور لٹیروں سے بچایا ہے۔ شکاریوں کے جال سے نکال کر بہت دور محفوظ مقام تک پہنچایا ہے۔'' بوڑھے نے معنی خیز انداز میں کہا۔ شاجو خاموش رہا۔ باپ نے زبان بند رکھنے کا وعدہ جو لیا تھا۔ اسے اپنا باپ اور اس کا قول بڑے عزیز تھے۔ ''باپو! تمھاری باتیں بعض اوقات میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ بعض دفعہ تو تم مجھے، ہاں باپو! تم مجھے دیوانے لگتے ہو۔'' شاجو الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''سمجھا کرو بیٹے! بوڑھے ملاح نے بیٹے کے کندھے پر شفقت بھرا ہاتھ رکھتے ہوئے فقط یہی کہنا کافی سمجھا۔ منزل ابھی کافی دور تھی۔

چار نفوس گھاٹ کے پاس خاموش کھڑے تاریخ کا سفر کر رہے تھے۔ خانو بھی منہمک تھا۔ شاجو گزرے لمحوں میں گم تھا...... ۱۴ سال کا شاجو باپ کے ہمراہ منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ اچانک انھیں اپنے سروں پر سرسراہٹ سنائی دی۔ بیک وقت دونوں کی نظریں اٹھیں۔ دو سفید پرندے تیزی سے آگے کی طرف نکل رہے تھے تھوڑی دور جا کر دونوں ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے یوں لگتا تھا جیسے ایک دوسرے کو ختم کر کے دم لیں گے تیزی سے وہ نیچے آتے پانی کے ساتھ لگتے اور اوپر اٹھتے ہوئے خونخوار انداز میں ایک دوسرے پر لپکتے۔ ''اللہ خیر کرے، آج تو زبردست طوفان کے آثار دکھائی دے رہے ہیں۔'' بوڑھے ملاح نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے چپوؤں کو تیز کر دیا۔ اسی لمحہ ایک تیز چیخ کے ساتھ ایک پرندہ پانی کی طرف گرتا اور دوسرا فاتحانہ انداز میں آوازیں نکالتا آسمان کی وسعتوں میں گم ہوتا دکھائی دیا۔ پانی میں ایک اور سرخ لکیر کا اضافہ ہو چکا تھا۔

کنارے تک پہنچتے پہنچتے بارش شروع ہو چکی تھی شاجو اور اس کے باپ نے کشتی کنارے کے ساتھ لگا کر کھڑی کی اور تیزی سے جھگیوں کی طرف جاتے راستہ کی طرف دوڑ لگا دی۔ مگر...... یہ کیا؟...... وہ یکدم ٹھٹھک کر کھڑے ہو گئے۔ ایک نقاب پوش پستول تانے راستہ روکے کھڑا تھا۔

''مکتی باہنی، مکتی باہنی'' دل نے صدا دی اور دوسرے ہی لمحہ وہ پر سکون تھے۔

''آ گئے ہو بڈھے! میں کئی دن سے تمھاری سرگرمیوں کو دیکھ رہا ہوں، کتنے پاکستانیوں کو پناہ دی ہے، بنگلہ دیش میں رہتے ہوئے ہمارے دشمنوں کی حمایت کرتے ہو۔ جانتے ہو اس کی کیا سزا ہے۔'' نقاب پوش انتہائی نفرت سے غرایا۔

''میں پاکستان کا باسی ہوں، میں پاکستانی ہوں، میں مسلمان ہوں، ہم سب ایک ہیں۔ وہ میرے بھائی ہیں۔'' بوڑھے نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی۔ ''لگتا ہے تم زندگی سے بیزار ہو گئے ہو'' وہ دوبارہ غرایا۔ ''تمھیں علم ہے تمھاری اس غداری سے تمھارے اور تمھارے گھر والوں پر کیا بیتے گی۔'' اس نے پستول لہراتے ہوئے کہا۔ ''ہاں! میں جانتا ہوں۔ سب جانتا ہوں، یہ غداری نہیں وفاداری ہے میں نے اس کا عہد کیا ہے، تم نے اس کا عہد کیا ہے، تم عہد سے پھر رہے ہو۔'' بوڑھا اطمینان سے بولا۔ ''اچھا تو پھر مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔'' اس نے ٹریگر پر دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میں ہر قسم کی قربانی کے لیے تیار ہوں۔ مگر پاکستان سے غداری نہیں کر سکتا۔'' بوڑھے ملاح کی آنکھوں سے عجب روشنی پھوٹ رہی تھی۔

''شٹ اَپ بڈھے، زبان کو لگام دو، کہو جے بنگلہ، کہو پاکستان مردہ باد، ورنہ تمھیں ابھی اپنی وفاداری کا صلہ ملتا ہے۔'' پستول کی نوک بوڑھے کے سینہ کو چھونے لگی وہ تن کر کھڑا ہو گیا۔ نقاب پوش یہ جرأت کہاں برداشت کرتا، پستول نے شعلہ اگلا اور بوڑھا ملاح وطن عزیز کے ساتھ، کیے گئے عہد پر قربان ہو گیا۔

شاجو کے ہاتھ کی گرفت آنے والے مہمانوں اور ننھے خانو پر اور مضبوط ہو گئی۔ وہ ماضی کے ورق الٹتا رہا...... اور پھر...... پھر...... شاجو کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے نقاب پوش کو سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اس پر چھلانگ لگا دی۔ باپو اسے ہر طرح کی گوریلا ٹریننگ دیتا رہتا تھا۔ حملہ آور نے اب تک اسے نجانے کیوں فراموش کر رکھا تھا۔ ''تم نے میرے باپو کو غدار کہا، غدار تو تم خود ہو، اسلام اور وطن کے غدار، اپنے ہی بھائیوں کے دشمن، ہم سب کے دشمن، میں تمھیں زندہ نہیں چھوڑوں گا'' شاجو نے اس کی گردن کو اپنی مضبوط گرفت میں لیتے ہوئے کہا۔

اس اچانک حملہ سے نقاب پوش بری طرح بوکھلا اٹھا۔ شاجو اس کی گردن کو شکنجہ میں کسے اس کے ساتھ چمٹا ہوا تھا۔ پستول پر حملہ آور کی گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی تھی آنکھیں باہر کو ابل آئی تھیں۔ یکدم وہ ساکت ہو کر زمین پر گر پڑا۔ شاجو نے نفرت سے اسے ٹھوکر ماری اور اپنے باپ کے مقدس لاشہ کی طرف متوجہ ہوا۔ دریا کے کنارے گیلی مٹی سرخ ہو رہی تھی۔ وہ مقدس خون کو اپنے سینہ میں جذب کر رہی تھی جو اسی کی خاطر بہا تھا۔ کشتی پانی میں ہلکورے کھا رہی تھی اور دریا کے دوسرے کنارے گھنے جنگل میں وطن کی وحدت و یگانگت کے علم بردار، پاکستان کے تحفظ اور بقا کے لیے جانیں قربان کرنے کا عزم کر رہے تھے۔ وہ، جنھوں نے ابھی کچھ دیر پہلے شاجو کے باپ کی کشتی میں دریا پار کیا تھا۔

شاجو نے خانو کو گود سے اتار دیا۔ تینوں دوستوں کی طرف دیکھا۔ وہ دم بخود کھڑے جیسے کنارے پر رقم تاریخ پڑھ رہے تھے۔ خانو بھی سب کو بڑی توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ وہ کبھی گھاٹ کے اس حصہ کو دیکھتا جس کی طرف شاجو بار بار اشارہ کرتا تھا اور کبھی کنارے کی اس زمین کو دیکھتا جس کے بارے میں اس کے باپ نے بتایا تھا کہ یہاں تمھارے دادا قربان ہوئے ہیں۔ کڑیاں پھر ملنے لگیں......

فائرنگ نے ملاحوں کی بستی میں ہلچل مچا دی تھی۔ معمول کی اس کارروائی سے وہ اچھی طرح آگاہ تھے۔ جائے واقعہ پر پہنچنے میں انھیں کوئی دیر نہ لگی تھی۔ شاجو اپنے باپ کے قریب کھڑا تھا۔ بستی کے باسی شاجو کے ارد گرد جمع تھے۔ وہ اس کے باپو کو سلامی دے رہے تھے۔ بوڑھے ملاح کے مشن کو زندہ رکھنے کا عزم کر رہے تھے۔ وہ عہد کر رہے تھے اسلام کی سربلندی کا...... پاکستان کی سلامتی اور یک جہتی کا...... چند نوجوانوں نے بوڑھے ملاح کے مقدس لاشہ کو کندھوں پر اٹھا لیا تھا۔ وہ نعرے لگا رہے تھے۔ ''ہم سب مسلم ہیں، ہم سب پاکستانی ہیں، تیرا میرا رشتہ کیا؟ لا الٰہ الا اللہ، بنگلہ دیش نا منظور۔ پاکستان زندہ باد......'' چند جوشیلے نوجوان مکتی باہنی کے ایجنٹ کی لاش کو دریا کی موجوں کی نذر کر رہے تھے دشمن اسلام کے غرقاب ہونے پر دریا کے پانی میں زبردست تلاطم برپا ہوا اور کنارے پہ کھڑے بوڑھے ملاح کی کشتی زبردست ہچکولے لینے لگی۔ جیسے غداری کے خلاف وہ بھی غیض و غضب کے اظہار میں سب کے ساتھ شریک ہو......

دریا کے کنارے کھڑا، شاجو ۲۶ سال کا سفر کر رہا تھا۔ اس نے اپنے کرتہ کی آستین سے بہتے آنسوؤں کو پونچھا۔ محبت بھری نظروں سے سب کو دیکھا اور پھر ماضی میں کھو گیا۔ یہ سب قربانیاں، جذبے، ولولے، اس طوفان کا راستہ نہ روک سکے جو اپنوں اور غیروں کی ملی بھگت اور اغیار کی چالوں کی بنا پر پورے مشرقی حصہ کو اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا، خون کی سرخی سفیدی میں بدل گئی۔ اور ان تمام سازشوں کا انجام بنگلہ دیش کی صورت میں رونما ہوا۔ ساری بستی میں کہرام مچ گیا تھا۔ دشمن شادیانے بجانے لگا اور شاجو...... اور اس کے ساتھی اپنے بزرگوں سے پڑھا ہوا، امن و اخوت کا درس عام کرنے پر جت گئے۔ مخلص دوستوں نے مشرق و مغرب کے درمیان کھینچی حد فاصل کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ شاجو کا گھر آباد ہوا مگر دل کا دیار اجڑا رہا۔ اپنوں کی محبت اور جدائی تڑپاتی رہی۔ ملاحوں کی پوری بستی اس سورج کے طلوع ہونے کی منتظر رہی جو دل و نگاہ پر پڑے نفرت و تعصب کے دبیز پردوں کو چاک کر دے، جو چاروں

طرف یگانگت کی روشنی پھیلا دے، جو بچھڑے ہوؤں کا ملاپ کر دے۔ وہ اندر اندر اپنے اس مشن کو زندہ رکھنے کی تدابیر کرتے رہے۔ زمین و آسمان حیرت وخوشی کے سنگم کے ساتھ تکتے رہے...... بہت سوں نے اس انتظار میں ابدی قیام کی راہ لی۔ مگر جانے سے پہلے وہ یہ امانت نئی نسلوں تک منتقل کرنا نہ بھولے۔ یہ بیج تناور درخت بنتا رہا۔ زمانہ، دوست، دشمن کی پہچان کراتا رہا۔ غلطیوں کا احساس پیدا ہوتا رہا۔ دل کی آنکھ کھلی......اور آج......آج......۲۶ سال بعد بچھڑنے والوں کی نسلیں آپس میں اس حال میں مل رہی ہیں کہ آنکھوں سے سیل ندامت رواں ہے۔ شاجو بڑا مطمئن اپنے دوستوں کی جانب تک رہا ہے جو مغربی خطہ سے اس کے لیے پیامِ محبت لائے ہیں۔ یہ سب بڑی چاہت سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔ معنی خیز مسکراہٹ لیے وہ مضبوط عہد و پیمان باندھ رہے ہیں۔ دریا بھی پرسکون ہے۔ دور نیلگوں فضاؤں میں دو پرندے چونچ سے چونچ ملائے محوِ پرواز ہیں۔ پوری کائنات ملاپ کے ترانے الاپ رہی ہے۔ سرگوشیاں کر رہی ہے۔ مغرب والوں نے یہ سفر بے مقصد نہیں کیا ہے اُن کا اور شاجو کا مشن ایک ہی ہے یہ اُنھیں بزرگوں کی اولاد ہیں جنھوں نے شاجو کے باپو کی چپوؤں والی کمزور سی کشتی میں بڑا اہم سفر کیا تھا۔ اور جس سفر کے بعد بوڑھا ملاح خود بھی بہت جلد ابدی سفر پر روانہ ہو گیا تھا۔

ہوا، شاجو اور اس کے دوستوں سے سوال کر رہی تھی ''تم ادھر رہو گے نا؟ ہاں۔ ہاں! یہ وطن ہمارا ہے۔ ہم ایک ساتھ جئیں گے اور ایک ساتھ مریں گے ہمیں یہ مٹی بڑی عزیز ہے، ہم سب مل کر ان فاصلوں کو ختم کریں گے جو دشمنوں نے ہمارے درمیان پیدا کر دیے ہیں۔ پورب اور پچھم ایک ہو جائیں گے۔ ہماری خوشیاں اور غم سانجھے ہیں ہم لا الہ کے علم تلے متحد ہیں۔ ملاپ کا سورج ضرور طلوع ہوگا۔ اک صبح روشن ہم ہی تو لائیں گے۔'' وہ سب یک زبان تھے۔

آٹھ مضبوط بازو حصار بنائے گھاٹ سے بستی کی طرف جا رہے تھے۔ دریا پرسکون اور روانی سے بہہ رہا تھا۔ ایک تابناک مستقبل خانو کی صورت میں شاجو کی انگلی تھامے بڑے اعتماد کے ساتھ قدم سے قدم ملا رہا تھا۔ جذبوں کے سفر کو منزل مل گئی تھی۔

☆......☆......☆

قانتہ رابعہ

# دروازہ کھلا رکھنا

ایک جیسے رنگ ایک جیسی شکل، ناز انداز طور طریقے لب و لہجے میں ایک جیسے...... جیسے جڑواں...... پہچاننا مشکل ہو جائے......لیکن مشترک نہیں تھی تو ان کی عمریں...... پورے سوا سال کا فرق تھا......لیکن قدرت نے اس فرق کو ان کی شکل عقل کی مماثلت میں آڑے نہ آنے دیا......! عمروں کے اس فرق کے باوجود ان کے تعلیمی مدارج ایک ساتھ اور ایک جیسے نمبروں سے طے ہوئے!

حیرت صد حیرت! کہ ان کی سوچوں کا انداز بھی ایک جیسا تھا...... بیک وقت ایک ہی خیال دونوں کے ذہن میں آتا اور جب وہ ایک دوسرے سے ڈسکس کرتے......

یا رب یہ گرمیاں کب ختم ہوں گی، یا، آج کڑھی چاول کھانے کو دل چاہ رہا ہے میرا......تو دوسرا بھی یہی کہہ رہا ہوتا......پھر......پھر......

ظفیر احمد اور نصیر احمد ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر کھِل کھلا کر ہنستے......

دونوں نے ایم بی اے کی ڈگریاں ایک ہی گریڈ میں لیں۔ جب دونوں نے ملازمت کے لیے بھاگ دوڑ شروع کی تو یہاں پر پہلا دھچکا لگا......ایک کو ملازمت کالج میں لیکچرر شپ کے لیے ملی دوسرا کسی فیکٹری میں جنرل مینجر کو پیارا ہو گیا۔ اس کے باوجود دونوں کا اٹھنا بیٹھنا، طور طریقے ایک سے ہی تھے......

اماں نے رشتے ڈھونڈنے شروع کیے تو کوشش یہی کی کہ دونوں سگی بہنیں ہوں......سگی بہنیں ملیں ضرور، لیکن شکل اور عقل میں، عادات اور طور طریقوں میں ایک دوسرے سے مختلف۔ کیریئر کے راستوں میں دور کرنے کے بجائے قدرت نے ان کی دلجوئی ہی کی اور دونوں کی ٹرانسفر ایک ہی شہر میں ہوگئی۔

دونوں نے ایک جیسے گھر بنوائے۔ بچے بھی اللہ نے سابقہ ریکارڈ دیکھتے ہوئے ہی دیئے......جس جس نے سنا......حیرت سے انگلیاں دانتوں تلے دبا لیں! پہلی دفعہ دونوں کے ہی بیٹے پیدا ہوئے......حالانکہ ظفیر کی بیوی خنساء کی دلی خواہش تھی کہ اس کے ہاں پہلوٹھی کی بچی پیدا ہو، جب سے اسے پتہ چلا تھا کہ سرکار دو عالمؐ نے فرمایا ہے کہ بابرکت ہے وہ عورت جس کے بطن سے پہلوٹھی کی بچی پیدا ہو۔ بچی کی خواہش دبی دبی رہی لیکن جب اس نے یہ پڑھا کہ تمام انبیاء ہی بیٹیوں کے باپ تھے......اسے پہلی دفعہ ہی بیٹی کی شدت سے خواہش پیدا ہوئی......لیکن قدرت نے دونوں کو پہلوٹھی کے بیٹے دیئے......

دوسری دفعہ دونوں کے ہاں بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ تیسری دفعہ پھر ایک آدھ دن کے وقفے سے بیٹے......! تیسرے بچے کی دفعہ تو با آواز بلند ہی بے ساختہ سب نے کہا۔

سبحان تیری قدرت!

کیا ایسے بھی ہو سکتا ہے؟

پھر اتنا بڑا فرق کہاں سے اور کیسے در آیا؟

تنخواہیں دونوں بھائیوں کی ایک جیسی، اولاد بھی گنتی میں برابر، اخراجات بھی اسی حساب کتاب سے پھر ایسے کیوں؟ نصیر کی بیوی رحماء سوچتے سوچتے تھک جاتی! ہزار جتن کروں، بجٹ متوازن رکھنے کے لیے سو سو پاپڑ بیلوں پھر ہر ماہ کی سولہ سترہ تاریخ کو رقم بھک سے کہاں اڑ جاتی ہے؟ رقم سنبھال سنبھال کر رکھنے اور ایک ایک دھیلا پیسہ سوچ سوچ کر خرچ کرتے اس کے اعصاب چٹخ جاتے......

میرے ساتھ ہی ایسے کیوں ہوتا ہے؟ اس نے دیوار سے دیوار ملے اپنی بہن خنساء کے گھر کی طرف دیکھ کر سوچا......! ایک ماہ دو ماہ، اب تو چار پانچ برس بیت گئے کفایت شعاری کے لیے ہلکان ہوتے ہوتے...... ہر جتن اس نے کر دیکھا۔ پہلے اس نے سوچا کہ شاید ہمارا

کھانا پینا اپنی بہن سے بہت اعلیٰ درجے کا ہے......اس نے خنساء سے کہا آئندہ تم جو پکانے کے لیے حق نواز سے منگواؤ گی وہی میرے لئے بھی منگوالیا کرنا......پھر ایسے ہی ہوا......کبھی دونوں گھر میں ہنڈیاں جا رہی ہوتیں تو کبھی ایک ہی دن ایک ہی وقت میں مونگ مسور کی دال کو بھگار کی خوشبواڑ اڑ کر ایک دوسرے کے گھر جا رہی ہوتی! اس کے باوجود معاملہ جوں کا توں رہا۔ وہ اکثر خنساء سے پوچھتی۔

’’کیا تمہاری بھی انیس بیس تاریخ فکر فاقوں سے شروع ہوتی ہے؟‘‘

خنساء ہنسی......نہیں اللہ کا شکر ہے میں تو بچتوں سے ہی اس دفعہ عمرہ کا پروگرام بنا رہی ہوں!

’’عمرہ کا......‘‘ رحماء کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

اس کی آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے۔ دل کا درد جمع ہو کر اک قطرۂ خون بن کر پلکوں پر جم گیا اور سوچنے بیٹھ گئی۔

اس نے گھر داری کیلئے کیا کیا قربانیاں نہیں پیش کیں؟ موٹر سائیکل چوری ہوا تو اپنا زیور بیچ کر نصیر کو نیا موٹر سائیکل لے کر دیا......حمدان کی دفعہ ہاسپٹل میں ستر اسی ہزار کا بل بنا جو اس نے ادھار لے کر ادا کیا......اگر کبھی اتفاق سے تنخواہ سے مہینہ پورا گزرتا ہی ہے تو بالکل اچانک ہی کوئی بہت ہی بڑی بلا منہ پھاڑے سامنے کھڑی ہوتی ہے......کل صبح ہی سو کر اٹھی تو دیکھا کچن میں پانی ہی پانی جمع ہوتا ہے۔ بدبودار میلا پانی......بہت دیر تک سوچتی رہی یہ پانی آیا کہاں سے...... فریج کھولی تو ہر چیز خراب، برف کے باؤل گرم پانی کی شکل اختیار کئے ہوئے تھے۔ فریز کی ہوئی چیزوں کی سڑاند بتا رہی تھی کہ فریج خراب ہوئے بیس گھنٹے ہو چکے ہیں اب مکینک کی مرضی جتنا چاہے مرمت کے نام پر بٹورے......

سوجن چھ سات ہزار روپوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی چٹکی بجانے میں نکل گئے......!

اس نے بی سی کے نام پر جو رقم وصول کی تو اگلے ہی دن اچانک حمدان کے پیٹ پر گرم ابلتا دودھ گر پڑا اور وہ ساری رقم علاج کیلئے خرچ ہو گئی۔

جائے تو کہاں جائے؟ میاں کے پیچھے پڑ گئی۔ مجھ سے گھر کا خرچہ نہیں سنبھالا جاتا......اپنے ہاتھ میں رکھیں تا کہ آٹے دال کا بھاؤ پتہ چلے......!

’نہ بابا نہ......‘ نصیر نے کانوں کو ہاتھ لگائے......تم اچھی ناشکری عورت ہو میاں مہینے بھر کی تنخواہ ہاتھ پر رکھتا ہے اور تم لینے سے انکاری ہو......! کیا خنساء بھابھی نے رقم لینے کی ذمہ داری بھیا کے کندھوں پر ڈال دی جو تم ایسا کرنے چلی ہو؟ نصیر نے حیرانی سے پوچھا۔

رحماء خوب روئی......ابھی وہ خنساء کی طرف سے آئی تھی...... تروتازہ چہرہ......خوش باش......چین ہی چین......صدقہ خیرات دیتے رہنا، سائل کو خالی ہاتھ نہ بھیجنا اگر خنساء کی گھٹی میں تھا تو رحماء کی بھی عادت اس سے بڑھ کر ہی تھی۔ پھر بھی یہ عالم......!

اس نے میاں سے وہ دکھڑے روئے کہ آپ کو کوئی اور جاب ڈھونڈنی چاہیے......

’’تمہاری عقل کہاں گئی ہے، جاب کیا پلیٹ میں رکھی مل جاتی ہے جو اس اچھی بھلی جاب کو ٹھکرا دوں......؟ سختی سے نصیر نے کہا۔ ’’مجھے نہیں پتہ آپ کی اتنی تنخواہ میں میرا گزارہ ممکن نہیں، آپ نہیں کریں گے تو میں جاب کی کوشش کرتی ہوں......‘‘ حتمی لہجے میں اس نے کہا میں تھک گئی ہوں اخراجات کو قابو کرتے کرتے......! زندگی نہ ہوئی پھانسی کا پھندہ بن گئی‘‘۔

’’کمال ہے، خنساء بھابھی بھی تمہاری بہن ہیں لیکن کبھی اخراجات کا رونا نہیں رویا......کبھی گلہ شکوہ نہیں کیا، بلکہ مجھے یاد ہے جب بھیا کو آسٹریلیا سے بہت اچھی جاب کی آفر ہوئی تھی تو ان سے پہلے خنساء بھابھی نے ہی انکار کیا تھا!‘‘ نصیر احمد نے کہا۔

رحماء پھٹی آنکھوں سے میاں کو دیکھ رہی تھی۔ گھٹی گھٹی آواز میں بولی۔

بھیا کو آسٹریلیا میں جاب ملی اور خنساء نے انکار کیا؟ کب؟

مجھے اس کا علم نہیں یہ ان سے ہی پوچھو تو بہتر ہے۔ لیکن اس واقعہ

کو دواڑھائی سال تو بیت ہی چکے ہیں......نصیر احمد نے تھک کر سر صوفے کی پشت سے لگایا......

''امی کہاں ہیں''؟ رحماء نے بہن کے گھر داخل ہوتے ہی بھانجے سے پوچھا۔

خالہ جان امی نماز پڑھ رہی ہیں، بھانجے نے اندر کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

رحماء بے دھڑک اندر داخل ہوگئی۔خنساء کی نماز اختتامی مراحل میں تھی......نماز مکمل ہوتے ہی رحماء نے بے یقینی سے پوچھا۔

اک بات سچ سچ بتاؤ گی؟

''کیا؟خنساء نے حیرانی سے کہا۔

''بھیا کو آسٹریلیا میں جاب ملی تھی اور تم نے بتایا ہی نہیں!'' رحماء نے شکوہ کیا۔

''جب جانا ہی نہیں تھا تو ڈھنڈورا پٹوانے کا فائدہ۔''

''یہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ اتنی اچھی پیشکش کو کیوں ٹھکرایا تم نے؟''

''اس لیے کہ رزق تو جتنا کاتب تقدیر نے مقدر میں لکھا ہے اتنا ہی ملے گا لیکن میرے گھر کا دروازہ فجر کے وقت بند ہو جاتا تو میں رزق کی برکت کہاں سے تلاش کرتی؟''

''کیا مطلب؟'' رحماء نے ناسمجھی سے کہا۔

''بس اپنا اپنا اعتقاد ہوتا ہے مجھے تو میرا مطالعہ یہی بتاتا ہے اور احادیث مبارکہ سے بھی طے ہے یہ بات کہ اللہ رب العزت روزی تو کافروں،مشرکوں کو بھی دیتے ہیں لیکن جو فجر کے وقت سویا رہے اس کے رزق سے خیر اٹھالی جاتی ہے میں نے تو شادی کے بعد ان گیارہ سالوں میں یہی ایک کوشش رکھی کہ کسی طرح فجر کی نماز کے لیے میرے گھر کا دروازہ ضرور ہی کھلے تاکہ رزق کے ساتھ اللہ کی رضا بھی ساتھ ہی داخل ہو۔''

اس لیے جب ان کو وہاں سے پیشکش ہوئی تھی تو میں نے کئی دفعہ سوچا بچے ابھی چھوٹے ہیں ظفیر چلے گئے تو انہیں فجر کی نماز پر کون لے کر جائے گا؟اور انہیں عادت نہ پڑی تو کیا میرے گھر کا دروازہ بند ہی رہے گا۔ایسے مشکل معاملوں میں تو بچے باپ کے ہی قابو آتے ہیں،میرے بس کی بات نہیں۔اس لیے میں نے صاف انکار کر دیا......اللہ کا شکر ہے اللہ نے فراخی اور برکت ہی رکھی ہے اب تک آئندہ بھی رکھے......'' خنساء نے کہا۔

رحماء حیران پریشان گم سم اس کی شکل دیکھ رہی تھی...... ہاں یہ ایک بڑا فرق ہے دونوں گھرانوں میں جو سب کی نظروں سے اوجھل رہا......میاں کو نماز کے لیے بھیجنا یا دروازہ کھولنا تو درکنار وہ تو خود بھی رات گئے تک ڈراموں کی ان قسطوں کو دیکھنے کی عادی ہے جو دن کو نہیں دیکھ پاتی......سیل فون پر جب الارم بج بج کر تھک جاتا تھا تو وہ آنکھوں پر پانی کے چھینٹے مار کر کس طرح بچوں کو اور میاں کو سوتی جاگتی کیفیت میں ناشتہ بنا کے رخصت کرتی ہے۔ یہ تو وہ ہی جانتی ہے یا اس کا رب......!

پھر خیر والا رزق کہاں سے آئے؟

الجھے سوال کا جواب اسے مل گیا تھا۔

☆......☆......☆

فرحی نعیم

# علاج

''کہاں سے آرہے ہیں؟''

''کون ؟ میں؟'' فیصل نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے نیم مزاحیہ انداز میں پوچھا ''ہاں تو آپ سے ہی پوچھ رہی ہوں، یہاں آپ کے سوااور کون ہے جس سے پوچھوں گی۔''

انیلا نے کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے تیز نظروں سے میاں کو گھورا۔

''ویسے بائی داوے میں روز اس وقت کہاں سے آتا ہوں؟'' فیصل نے جواب دینے کے بجائے الٹا انیلا سے سوال کیا اور کلائی سے گھڑی اتارنے لگا۔ پھر اس نے جوتے اتارے اور الماری سے تولیہ نکالنے لگا۔

''آتے تو دفتر سے ہی ہیں لیکن آج آپ دفتر کے ٹائم سے گھنٹہ بھر پہلے کے اُٹھے ہوئے ہیں اور اب چھ کے بجائے ساڑھے چھ ہورہے ہیں۔'' انیلا نے منٹ منٹ کا حساب رکھا ہوا تھا۔ اور وہ ایسا ہی کرتی تھی۔ شادی کو تین سال ہو چکے تھے۔ اور ان تین سالوں میں اس نے فیصل کے آنے جانے، کھانے پینے، سونے جاگنے ہر چیز کا مکمل ٹائم ٹیبل بنایا ہوا تھا جس پر عمل کرنے کا وہ پابند تھا اور پچھلے پونے تین سالوں سے وہ بڑی تابعداری سے اس ٹائم ٹیبل پر عمل بھی کر رہا تھا بس اب چند مہینوں سے کچھ کچھ بغاوت کر جاتا تھا۔

''اُف تمہاری یہ جاسوسی......! ارے بابا بندہ آفس کے کام سے بھی جا سکتا ہے اور......'' ''آفس کا کون سا کام آ گیا، اور ویسے بھی آپ کا کوئی فیلڈ ورک تو ہے نہیں، آفس کا کام آفس میں بیٹھ کر ہی ہوتا ہے پارکوں یا ہوٹلوں میں نہیں۔'' انیلا نے چبا چبا کر فیصل کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''پا...... پارک، ہوٹل یہ تم کیا کہہ رہی ہو، مم میں کب کسی پارک یا ہوٹل میں گیا میں تو...... میں تو وسیم سے ملنے کے لئے اُٹھ گیا تھا، وہ کب سے بلا رہا تھا۔'' فیصل نے ہکلاتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

''لیکن ابھی تو آپ کہہ رہے تھے آفس کا کام......'' انیلا نے غصے سے گھورا۔

''ارے بھئی تم نے میری بات مکمل کب ہونے دی تھی میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ بندہ کبھی آفس کے کام سے یا کبھی کسی دوست سے ملنے کے لئے بھی دفتر سے جلدی اُٹھ سکتا ہے۔ یہ تمہاری شک کرنے کی عادت نا کبھی مروا دے گی۔'' فیصل نے جلدی سے بات مکمل کر کے واش روم کی راہ لی۔

''کیسے آپ کو؟'' انیلا نے واش روم کی طرف بڑھتے فیصل سے پوچھا:

''نہیں تم کو'' فیصل نے زیرلب کہا۔

''کیا کہہ رہے ہیں''

''کچھ نہیں، تم چائے بناؤ میں چینج کر کے آ رہا ہوں۔''

''کیوں اُس نے چائے نہیں پلائی؟'' اس نے دروازہ بند کرتے میاں سے ایک اور سوال کیا۔

''دوبارہ پی لوں گا تو بیمار نہیں ہو جاؤں گا۔'' اس نے جواب دیا اور جلدی سے دروازہ لاک کیا مبادا پھر کوئی سوال نہ آ جائے۔

''ہونہہ، ہو بھی سکتے ہیں۔'' وہ بڑبڑائی اور کچن کی طرف چل دی۔

☆......☆......☆

انیلا ایک شکی مزاج لڑکی تھی۔ شادی سے پہلے ماں اور دوستوں نے کچھ اس طرح اُسے میاں کو قابو میں رکھنے اور اس کے لمحے لمحے کی خبر رکھنے اور اس کی سرگرمیوں سے واقف رہنے کی الٹی پٹیاں پڑھائی تھیں کہ اب انیلا ہر پل اسی وہم میں رہتی کہ نہ جانے فیصل اب کہاں ہوگا؟ کیا کر رہا ہوگا؟ ایک تو وہ پہلے ہی کچھ شکی تھی اوپر سے سہیلیوں کی باتوں

میں آ کر وہ زیادہ ہی مشکوک رہنے لگی تھی۔ میاں کو کھینچ کر رکھنے کے چکر میں اُس نے فیصل تو فیصل اپنی زندگی مشکل کر لی تھی۔ اب تو فیصل بھی اس کی اس بُری عادت سے تنگ آ چکا تھا اور رسہ تڑانے کے بہانے ڈھونڈتا۔ شروع میں تو وہ اسے بیوی کا پیار اور فکر سمجھتا لیکن اب جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا تو وہ بھی اس کی اس عادت سے بیزار ہو چلا تھا۔ اور آج بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہوا تھا۔

چائے کے دوران بھی وہ میاں سے الٹے سیدھے سوال کرتی رہی۔ فیصل بھی یہاں وہاں کی ہانکتا رہا۔ اب نہ جانے انیلا کی تشفی ہوئی یا نہیں۔ لیکن فیصل نے چائے کے بعد لا پروائی سے ٹی وی لگا لیا تھا۔ اور اب وہ پوری توجہ سے کرکٹ میچ دیکھ رہا تھا۔ انیلا کو معلوم تھا کہ اب جو فیصل میچ دیکھ رہا ہے تو اب اُسے اپنے کسی سوال کا جواب نہیں ملے گا کیونکہ وہ پوری طرح میچ میں منہمک ہو جاتا تھا۔

لہٰذا وہ پیر پٹختی اُٹھ گئی۔

☆......☆......☆

فیصل ایک دفتر میں اوسط درجے کا ملازم تھا۔ گھر میں گزارا کھینچ تان کر ہی ہوتا اگر انیلا کے باپ بھائی مختلف طریقوں سے اس کی مدد نہ کرتے رہتے۔ جب بھی وہ اس کے گھر آتے تو کبھی خالی ہاتھ نہ آتے۔ کبھی فروٹ تو کبھی دودھ کے ڈبے بسکٹ، جام، بوتلیں غرض ضرورت کی بیشتر اشیاء وہ اُسے بھجواتے رہتے۔ جب بھی امی بازار جاتیں اور وہ عموماً انیلا کے ساتھ ہی جاتیں تو جو وہ اپنے اور اپنے گھر کے لئے خریدتیں وہی سب انیلا کے لئے بھی ضرور لیتیں۔ اپنا گرمی، سردی کا سوٹ خریدتیں تو بیٹی کو بھی دلاتیں۔ وہ کتنا ہی نہ نہ کرتی لیکن وہ زبردستی خرید لیتیں۔ انیلا کے والد بنک میں اچھی پوسٹ پر تھے۔ اس طرح اس کے تینوں بھائی بھی مختلف محکموں میں اچھی تنخواہیں لے رہے تھے۔ انیلا تین بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ شادی والدین کی خواہش کے برخلاف اونچی جگہ نہ ہو سکی۔ لہٰذا باپ بھائی اپنی لاڈلی کو کسی پریشانی میں نہ دیکھنا چاہتے تھے اور آنے بہانے سے اس کا گھر بھرتے رہتے۔ انیلا منع بھی کرتی تو پیار بھری ڈانٹ سے اس کو خاموش کرا دیا جاتا۔ اور ویسے بھی گھر آتا فضل کیسے بُرا لگتا ہے۔ یہی حال فیصل کا تھا اگرچہ وہ منع کرتا لیکن اس پر اصرار نہ کرتا کیونکہ اس طرح انیلا، اس پر خرچے کے لئے زیادہ دباؤ نہ ڈالتی اور اس کی فرمائشیں بن کہے پوری ہوتی رہتیں اور یوں فیصل کی لگی بندھی تنخواہ میں بھی ان دو میاں بیوی کا گزارہ ٹھیک ٹھاک طریقے سے ہو جاتا۔ لیکن پھر اس کے نتیجے میں وہ سُسر اور سالوں سے دبا ہی رہتا۔ انیلا بھی میکے سے آنے والے سامان پر اتراتی اور اس طرح فیصل پر حاوی ہی رہتی۔

☆......☆......☆

فیصل گھر آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک مشہور بیکری کا کیک کا ڈبہ تھا۔ چہرے سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔

''کیا بات ہے؟ یہ کیک کس نے دیا؟''

''کسی نے نہیں، میں لے کر آیا ہوں۔ میری ترقی ہو گئی ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''اور کس کس کو دیئے؟''

''سب سے پہلے تو گھر کے لئے یعنی تمہارے لئے لیا ہے۔ باقیوں کے لئے بعد میں لیں گے۔''

''باقی کس کس کے لیے؟''

''ارے یار تم بجائے میری پروموشن پر خوش ہو، اس کے بارے میں بات کرو، تم تو کیک کی تفتیش کرنے لگیں۔'' وہ چڑ گیا تھا۔

''آں۔ ہاں'' انیلا سنبھلی ''مزے کا ہے'' اس نے کیک کا ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے کہا ''سب سے پہلے امی کے گھر بھجوایئے گا اور اسی بیکری کا۔'' اس نے کھانے کے ساتھ میاں کو یاددہانی کروائی، جواب میں فیصل سر ہلانے لگا۔ شادی کے بعد یہ اس کی پہلی ترقی تھی۔ فیصل اپنی اس کامیابی پر بہت خوش تھا کیونکہ اب اس کی تنخواہ کا پیکیج بھی پہلے سے بہتر ہو جانا تھا اور ساتھ ہی دفتر کی طرف سے کئی سہولتیں بھی ملنے والی تھیں۔ سب سے بڑھ کر اب وہ سُسرال میں سر اُٹھا کر جا سکتا تھا اور اب اُن کے آگے جی حضوری کا دور ختم ہونے والا تھا۔

☆......☆......☆

''یہ اب آپ کچھ زیادہ ہی تیار شیار ہو کر آفس نہیں جانے لگے۔''

انیلا، میاں کو دوبارہ ناشتے کا کہنے آئی تھی تو دیکھا وہ اب تک آئینے کے سامنے کھڑا بالوں میں جیل لگا رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ ٹائی باندھ رہا تھا۔ پھر اس نے کتنی ہی دیر تک اپنے آپ کو دیکھنے میں لگائی تھی اور پھر ٹک سک سے تیار ہو کر کتنا ہی پرفیوم اپنے اوپر انڈیلا تھا۔

''آفس تیار ہو کر ہی جایا جاتا ہے کوئی سر جھاڑ منہ پہاڑ ہو کر تو نہیں۔''

فیصل نے آخری بار آئینہ میں نگاہ ڈالی اور اپنا والٹ اٹھایا۔

''لیکن تیاری کی کوئی حد ہوتی ہے، میں کتنے دن سے دیکھ رہی ہوں آپ آدھے گھنٹے تک آئینہ کے سامنے کھڑے رہتے ہیں، اتنی دیر تو دولہا کو بھی تیاری میں نہیں لگتی ہوگی۔ آخر چکر کیا ہے مجھے بھی تو پتہ چلے۔''

''افوہ تم تو ہر بات میں کوئی چکر نکال لیتی ہو، وہ جھنجھلایا۔'' ارے بھئی میرا گریڈ بڑھا ہے، ڈیپارٹمنٹ بدلا ہے۔ یہاں میرے سارے کولیگ اس طرح آتے ہیں پھر میرا افسران کے پاس آنا جانا رہتا ہے، ان کے پاس جاتا ہوں۔ اچھی طرح ڈریس اپ ہوں گا تو امپریشن بھی اچھا پڑتا ہے۔''

''بس بس مجھے زیادہ وضاحتیں دینے کی ضرورت نہیں خوب جانتی ہوں، لڑکیوں کو متاثر کرنے کے طریقے ہیں۔''

''اچھا یوں تو یونہی سہی۔'' وہ غصہ سے بولا اور کمرے سے باہر نکلا۔

''کہاں جا رہے ہیں ناشتہ تو کرتے جائیں۔'' وہ پیچھے آتے ہوئے بولی۔

''نہیں کرنا مجھے ناشتہ۔'' وہ غصہ سے بولا اور باہر نکل گیا۔

''نہ کریں مجھے کیا، سچ بول دیا تو کیسا تیر کی طرح لگا۔ مجھے بے وقوف سمجھا ہوا ہے، کوئی کنوارے تو ہیں نہیں جو یوں بن سنور کر جا رہے ہیں، شرم تو آتی نہیں شادی شدہ ہو کر لڑکیوں کو رجھانا۔ اونہہ'' وہ غصہ میں ناشتہ کرتے ہوئے ساتھ ساتھ بڑبڑاتی بھی جا رہی تھی۔

☆......☆......☆

ترقی ہونے کے بعد جب اُسے پہلی دفعہ تنخواہ ملی تو وہ سیدھا بازار گیا اور اپنے لئے دل کھول کر شاپنگ کی۔ کتنے عرصہ بعد اُس نے اپنے لئے اس طرح شاپنگ کی تھی ورنہ زیادہ سے زیادہ وہ ایک وقت میں دو شرٹیں ہی خریدتا۔ زیادہ کی کبھی جیب ہی اجازت نہ دیتی تھی۔ ساتھ ہی اُس نے انیلا کے لئے بھی ایک خوبصورت ریڈی میڈ سوٹ خریدا اور ایک ہینڈ بیگ بھی لیا۔ جانتا تھا انیلا کو بیگ بہت پسند ہیں۔ لدا پھندا وہ گھر آیا اور آتے ہی اس نے سارے شاپنگ بیگ صوفے پر ڈھیر کر دیئے۔

''یہ کیا ہیں؟'' انیلا جو میگزین لئے بیٹھی تھی اُسے ڈھیروں شاپر صوفے پر ڈالتے دیکھ کر حیرانی سے پوچھ رہی تھی۔ شاپنگ مال چلا گیا تھا۔ کتنا عرصہ ہوا میں نے اپنے لئے کچھ نہیں خریدا تھا، آج تنخواہ ملی تو لے لیا'' وہ جوتے موزے اتارتے ہوئے بولا۔

''اتنا کچھ، کیا پورے سال کی اکٹھی شاپنگ کر لی؟ پوری تنخواہ تو ختم کر کے نہیں آ گئے؟ میں نے اتنا کچھ سوچا تھا کہ......'' وہ ساتھ ساتھ شاپر بھی کھول کھول کر دیکھ رہی تھی۔ ''یہ کس کا ہے؟'' اس نے گلابی سفید رنگ کا سوٹ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ظاہر ہے تمہارا ہے اور کس کا ہوگا؟''

''اچھا میں سمجھی کہ شاید کسی......''

''کیا مطلب؟ کیا سمجھیں؟''

''میں نے سوچا کہ شاید اپنی کسی کولیگ کے لئے تحفہ لے لیا ہے۔''

''تمہاری سوچ اس سے آگے کا سفر کیوں نہیں کرتی؟'' اُسے یہ سُن کر سچ مچ تپ چڑھ گئی تھی۔ لیکن انیلا نے جواب دینا ضروری نہ سمجھا تھا۔

☆......☆......☆

فیصل کو اب آئے دن دفتر سے دیر ہو جاتی تھی۔ انیلا دل ہی دل میں کڑھتی رہتی تھی۔ دیر سے گھر آنے پر ان کی آئے دن جھڑپ رہتی تھی۔ آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ فیصل گھر آیا تو رات کے آٹھ بج رہے تھے۔

''یہ آخر ہر روز آپ کہاں چلے جاتے ہیں، گھڑی دیکھیں کیا ٹائم ہو رہا ہے۔ میں تنہا یہاں بیٹھی رہتی ہوں۔''

''دفتر کا کام اب بڑھ چکا ہے، تمہیں یہ بات میں کتنی دفعہ بتا چکا

ہوں، فائلوں میں سر کھپا کر آتا ہوں، تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے میں تفریح کر کے آرہا ہوں۔''

وہ گلے سے ٹائی کھینچتے ہوئے تلخی سے بولا۔

''ہونہہ جیسے میں یقین ہی تو کرلوں گی۔''

''تو نہ کرو، مجھے تم کو یقین دلانے کی ضرورت بھی نہیں۔'' وہ پیر پٹختے ہوئے اندر کی طرف بڑھ گیا۔

ایک طرف دفتر میں ذمہ داریاں اس پر بڑھ گئی تھیں تو ساتھ ساتھ انیلا کی بدگمانیوں میں بھی اضافہ ہوتا چلا جارہا تھا۔ اب فیصل وہ فیصل تو رہا نہیں تھا جو سُسرال کے پیسے پر پل رہا تھا۔ اب وہ خود اچھا کھاتا کماتا تھا۔ اب اُسے کسی کی پروا نہ تھی بہت جلد اُسے دفتر کی طرف سے گاڑی ملنے والی تھی اور اس کا انکریمنٹ بھی لگنے والا تھا۔ یہ بات اُسے دفتر کے کچھ ایسے لوگوں نے بتائی تھی۔ جن کو اندر کی خبریں ملتی رہتی ہیں۔ یہ سُن کر تو فیصل گویا ہواؤں میں اُڑنے لگا تھا۔ یہ مرتبہ پانے کے اُس نے کتنے خواب دیکھے تھے اور اب یہ سپنا حقیقت بننے والا تھا۔ اس کے دفتر میں کتنی لڑکیاں تھیں اکثر سے اس کی اچھی دعا سلام تھی۔ تین چار سے تو اس کا ہنسی مذاق بھی تھا اور انہی میں ماریہ بھی تھی۔ حسین، طرح دار، نٹ کھٹ سی، وہ ایک اچھے خاندان سے تعلق رکھتی تھی، پڑھی لکھی تھی۔ چند ماہ سے فیصل کی اُس سے بڑی اچھی دوستی ہوگئی تھی۔ اکثر وہ لوگ لنچ ساتھ ہی کرتے۔ کبھی دفتر میں اور کبھی دفتر سے باہر کسی قریبی ریسٹورنٹ چلے جاتے۔ اِدھر اُدھر کی ڈھیروں باتیں کرتے۔ ماریہ کے ساتھ گزارے لمحات فیصل کو بڑے خوشگوار لگتے۔ کبھی کبھی تو اس کا دل چاہتا کہ یہ لمحات امر ہو جائیں۔ وہ ماریہ کے ساتھ ایسے ہی بیٹھا رہے اس کو دیکھتا رہے اور اس سے باتیں کرتا رہے۔

☆......☆......☆

''کل آپ شیزان ریسٹورنٹ میں دوپہر ڈیڑھ بجے کس لڑکی کے ساتھ خوب ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے؟'' فیصل دفتر سے گھر آیا تو آتے ہی انیلا نے کڑے تیوریوں کے ساتھ اُسے آڑے ہاتھوں لیا تھا۔

''ہاں!'' فیصل اس اچانک حملے کے لئے تیار نہ تھا ایک دم چونک گیا۔

''کیوں، کیا سنائی نہیں دی میری بات؟''

''آں، ہاں وہ کولیگ تھے، سب مل کر لنچ کر رہے تھے'' وہ ایک دم سنبھلا اور جلدی سے بہانہ بنایا۔ ''تمہیں کس نے بتایا؟''

''مل کر؟'' وہ ٹھٹکی ''لیکن وہاں تو صرف ایک لڑکی تھی، باقی کیا سلیمانی ٹوپی پہنے تھے۔'' وہ طنز کرتے ہوئے بولی۔

''انہوں نے سلیمانی ٹوپی پہنی تھی یا جادو کی چھڑی گھمائی تھی۔ تم کو میرے دفتری معاملات میں دخل اندازی کرنے کی ضرورت نہیں، آئندہ اگر تم نے میری جاسوسی کرنے کی کوشش کی تو نتیجہ اچھا نہیں ہوگا، یہ تم کان کھول کر سُن لو۔'' وہ اُسے انگلی اٹھا کر وارننگ دیتے ہوئے بولا تھا اور انیلا آج اس کے لہجے میں چھپی پھنکار سے کانپ گئی تھی۔

☆......☆......☆

فیصل کے روز و شب تبدیل ہو چکے تھے۔ اُسے آفس سے گاڑی مل چکی تھی اور دیگر سہولتیں بھی، انیلا اب بھی اس کی مصروفیات سے باخبر رہنے کی پوری کوشش کرتی۔ فیصل کی لاپروائی اور لاتعلقی نے اُسے چڑچڑا بنا دیا تھا۔ اور پھر انہی دنوں اُسے یہ اطلاع ملی کہ فیصل نے اپنی کسی کولیگ سے شادی کرلی ہے اور اُسے کوئی فلیٹ بھی لے کر دینے والا ہے۔ یہ خبر سُن کر اُسے ایسا لگا کہ کسی نے اس کے سر پر بم پھوڑ دیا ہے اور اس کی ذات کے پرخچے اُڑ گئے ہیں۔ فیصل ایسا کیسے کرسکتے ہیں؟'' سوچ سوچ کر اُس کا سر پھوڑے کی طرح دُکھنے لگا۔

''آنے دو، ابھی پوچھتی ہوں؟ اس کی یہ ہمت، میں مر تو نہیں گئی تھی، پیسہ کیا ہاتھ میں آیا ہے، آسمانوں پر اُڑنے لگے موصوف'' وہ کتنی دیر فیصل کے انتظار میں ٹہلتی رہی۔ فیصل آیا تو ساتھ میں اس کا کوئی دوست بھی تھا۔ دونوں کچھ دیر دفتری معاملات پر ڈسکس کرتے رہے۔ گھنٹہ بھر کے بعد جب وہ گیا تو فیصل کمرے میں جا کر لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھ گیا۔

''فیصل مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔'' وہ چیخ کر بولی تھی۔

''میں مصروف ہوں۔'' فیصل بے نیازی سے بولا۔

''کون ہے وہ لڑکی جس سے آپ نے شادی کی ہے؟''

''اوہ! تمہیں پتہ چل گیا، جس نے تم کو میری شادی کے متعلق بتایا اس نے لڑکی کا نام پتہ نہیں بتایا۔'' اس نے اسکرین سے لمحہ بھر نظر ہٹا کر اطمینان سے انیلا کو دیکھ کر کہا اور پھر نظریں اسکرین کی طرف گھما لیں۔

انیلا کا تو دکھ اور غصہ سے لگتا تھا دماغ ماؤف ہو رہا ہے۔ وہ کتنی خوش گمانی کر رہی تھی کہ شاید، شاید فیصل یہ کہے کہ یہ سب جھوٹ ہے، بکواس ہے، جو کچھ اس نے سنا وہ کسی نے بالکل غلط کہا ہے۔ لیکن یہ سب تو سچ نکلا تھا۔ نہ صرف سچ بلکہ فیصل نے تو بڑے مطمئن انداز میں اعتراف بھی کر لیا تھا۔

''کیوں کی آپ نے شادی۔'' صدمے سے اُس کی آواز پھٹ سی گئی تھی۔

''چلاؤ نہیں، میں نے شادی کیوں کی اس کی وجہ بھی تم ہی ہو۔ تمہاری شکی عادت نے میری زندگی عذاب بنا دی تھی۔ تمہیں ہر وقت یہی فکر رہتی تھی نا کہ میں کہاں ہوں، کس کے پاس ہوں؟ کیا کر رہا ہوں؟ اب تم کو پریشان رہنے کی ضرورت نہیں ہو گی کیوں کہ تمہیں ہر وقت اس کی خبر رہے گی کہ میں یہاں نہیں تو ماریہ کے پاس ہوں گا۔ تمہیں تو میرا شکر گزار ہونا چاہیے کہ میں نے تم کو شک وفکر سے نجات دے دی۔''

فیصل کے طنزیہ جملے اُسے آگ لگا رہے تھے۔

''آپ...... آپ کو اسے طلاق دینا پڑے گی، میرے ہوتے ہوئے یہ نہیں ہو سکتا۔''

انیلا کا چہرہ غصہ کی زیادتی کے باعث لال ہو رہا تھا۔ ''آپ اُسے چھوڑ دیں۔''

''اُسے چھوڑ دوں یا تم کو طلاق دے دوں؟'' اس خوش فہمی میں بھی نہ رہنا، یہ لو۔''

فیصل نے ایک چیک اس کی طرف بڑھایا۔

''یہ...... یہ کیا ہے؟'' وہ لڑکھڑاتی آواز میں بولی۔

''یہ تمہارا مہر یعنی ایک لاکھ کا چیک ہے۔ اگر زیادہ بولیں تو میں ساتھ میں طلاق نامہ بھی پکڑا دوں گا۔ اگر چہ میرا کوئی ارادہ نہیں ہے تمہیں طلاق دینے کا۔ تمہاری خاموشی تمہارے ہی لئے فائدہ مند ہے۔ ماریہ کو میں یہاں نہیں لاؤں گا ورنہ تم اس کا بھی جینا دوبھر کر دو گی اس کو میں الگ ہی فلیٹ میں رکھوں گا۔ اور اب جاؤ مجھے کام کرنے دو۔''

فیصل نے جیسے بات مکمل کر لی تھی اور اب پھر اس کی انگلیاں کی بورڈ پر چل رہی تھیں۔ اور انیلا کے پاس تو جیسے اب کہنے سننے کے لئے کچھ بچا ہی نہ تھا وہ تو جھاگ کی طرح بیٹھ چکی تھی۔ اُس نے آنسو بھری نظروں سے ایک نگاہ فیصل پر ڈالی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ انگلیوں میں دبا چیک اُسے اس کے مستقبل سے آگاہ کر رہا تھا۔ امی ابو نے اسی لئے ایک لاکھ کا مہر باندھا تھا کہ اُس کی زندگی محفوظ رہے گی کیونکہ فیصل کے معاشی حالات اتنی بڑی رقم ادا کرنے سے قاصر تھے لیکن آج فیصل نے یہ رقم اس کے منہ پر مار دی تھی۔ اور ہر قسم کی غلط فہمی سے نکال دیا تھا۔ وہ تھک کر باہر صوفے پر ہی ڈھے گئی تھی۔ اس کی شکی اور تیز مزاج طبیعت نے اس کی زندگی برباد کر دی تھی۔

☆......☆......☆

جلد ہی فیصل نے ماریہ کو ایک فلیٹ کرائے پر لے دیا تھا ورنہ نکاح کے بعد سے وہ اب تک اپنے والدین کے گھر ہی رہ رہی تھی۔ اگر چہ اس کے گھر والے شادی دھوم دھام سے چاہتے تھے لیکن فیصل نے انہیں اپنی مجبوریاں بتائیں اور یہاں ماریہ نے بھی فیصل کی محبت سے مجبور ہو کر اپنے گھر والوں کو راضی کیا۔ چنانچہ گھر میں ہی خاندان کے لوگوں کو بلا کر رخصتی کی گئی فیصل کی طرف سے اس کے چند دوست ہی تھے۔ والدین تو اس کے تھے نہیں۔ ایک بھائی بہن تھے تو وہ بھی دوسرے شہروں میں رہتے تھے اور فیصل کی اُن سے اب صرف فون پر ہی خیر خیریت ہو جاتی تھی۔ دونوں اپنے مسائل میں گھرے تھے لہٰذا آنا جانا، ملنا جلنا ختم ہو چکا تھا۔ ولیمہ فیصل نے ماریہ کے کہنے پر ایک ہوٹل میں کر لیا تھا لیکن یہاں بھی مختصر ہی لوگ تھے اس کے چند قریبی دوست اور ان کی فیملی اور ماریہ کے گھر والے۔ یہاں اُس نے سب کو ایک اچھا ڈنر دے دیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو پا کر کافی خوش تھے۔

☆......☆......☆

فیصل اب ہفتے میں چار دن ماریہ کے ساتھ اور دو تین دن انیلا کے پاس گزارتا انیلا اب زیادہ تر خاموش ہی رہتی ۔ فیصل اور وہ اب تقریباً لاتعلقی کی زندگی گزار رہے تھے ۔ ماریہ نے شروع میں تو اپنے والدین کے گھر اور دوستوں وغیرہ کے ہاں جا کر دن گزارا لیکن پھر گھبرا کر ایک اسکول میں جاب کر لی کیونکہ فیصل نے اس کی آفس جاب چھڑوا دی تھی ۔ ماریہ اسکول سے آتی ۔ گھر کے کام کاج تھوڑے بہت کر کے آرام کرتی اور پھر شام کو فیصل کا انتظار کرتی ۔ جس دن وہ انیلا کے پاس جاتا اس دن بہت ناراض ہوتی لیکن فیصل نے اسے شادی سے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ فی الحال انیلا کو نہیں چھوڑے گا ۔ لہٰذا ماریہ اُسے اس بات پر مجبور نہیں کرے گی ۔ یوں وہ اس سے زبردستی نہیں کر سکتی تھی ۔ فیصل کی ماریہ کے ساتھ شادی کو ایک سال ہو گیا تھا ۔ زندگی اس طرح لگی بندھی روٹین میں گزر رہی تھی ۔ انیلا نے شاید حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا ۔ لیکن اب ماریہ کے سوالات وقت کے ساتھ بڑھنے لگے تھے ۔

''کیا آپ انیلا کی طرف چلے گئے تھے ۔'' فیصل ابھی کچھ دیر پہلے ہی گھر آیا تھا ۔

''نہیں ، کیوں ؟ تم کیوں یہ پوچھ رہی ہو ؟'' وہ چونکا ۔

''ٹائم جو اتنا ہو گیا ، تو پھر کہاں رہ گئے تھے ؟'' اس کا انداز کچھ مشکوک تھا ۔

''فیصل جو آئینہ کے سامنے کھڑا بال ٹھیک کر رہا تھا ایک دم ہی ٹھٹک گیا ۔ اس وقت ماریہ اسے انیلا کا دوسرا روپ لگی ۔ وہ چند لمحے ماریہ کو غور سے دیکھتا رہا پھر ہاتھ سے برش رکھ کر اس کے قریب آیا اور اُسے کندھے سے تھام کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سرد لہجے میں جو بولا وہ ماریہ کو ہلا دینے کے لئے کافی تھا ۔

''انیلا مجھ پر بہت شک کرتی تھی ۔ حالانکہ میرا تم سے شادی کا کوئی ارادہ نہ تھا لیکن انیلا کی شکی طبیعت نے مجھے تم سے قریب کر دیا اور میں نے تم سے شادی کر لی ۔ اُس کا علاج یہی تھا کہ اس کا بار بار کا شک ایک ہی بار یقین میں بدل دیا جائے ۔ اب وہ مجھ پر نہ تو شک کرتی ہے اور نہ کسی قسم کا شکوہ اس کی زبان پر آتا ہے ۔ اور آج تمہارے انداز میں بھی مجھے انیلا کی جھلک نظر آئی ۔ انیلا کے شک کا نتیجہ تم ہو اور...... اور......'' اس نے اچانک چہرے پر آئی سختی دور کی اور اب اس کے چہرے پر ایک اجنبی سی مسکراہٹ تھی ۔ ''کیا تم بھی شک کرنا چاہتی ہو ؟''

فیصل کے ہاتھوں کا دباؤ اس کے کندھوں پر ایک دم بڑھا اور پھر اگلے لمحے اُس نے اپنے ہاتھ ماریہ کے کندھوں سے ہٹا لئے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی غائب ہو گئی تھی ۔ پھر وہ سیٹی پر کوئی دھن بجاتا ہوا کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا ۔ دوسری طرف ماریہ اپنی جگہ سُن کھڑی رہ گئی تھی ۔

☆......☆......☆

عافیہ رحمت

# شکریہ اللہ میاں!

سوچیں......!اور صرف سوچیں ہی کوئی اثر نہیں دکھا سکتیں۔آنسو میری آنکھوں سے پھر موتیوں کی مانند ٹوٹ ٹوٹ کر اِدھر اُدھر بکھر رہے تھے۔یہ سال بھی ختم اور میری تمام خواہشیں......یااللہ میں نے آپ سے جو جو چیزیں مانگیں ان میں سے کوئی ایک بھی نہ ملی۔شکوؤں کی بھرپور فصل میری من کی کھیتی کو بھُس بنا رہی تھی۔''ربِ تعالیٰ سے مانگا ہے ناں......! تو بھرپور امید سے مانگو!'' میری امی کی نصیحت کانوں میں گونجی۔

امی......اور امی کی پوری زندگی میری نظروں کے سامنے ہی تھی۔ پوری کی پوری صبر اور جہدِ مسلسل سے عبارت! نہ کوئی شکوہ نہ جزع وفزع واویلا! بس صبر وسکون کے ساتھ مشقت بھری زندگی۔

''اللہ ہی تو ہے ہمارا دوست و مددگار کیا وہ نہ دے گا وہ چیز جو ہم اُس سے مانگتے ہیں۔ وہ ہم کو وہی چیز دے گا جو ہمارے لئے مفید و فائدے مند ہوگی۔ دیکھو بیٹا! جیسے تم اپنے چھوٹے نادان بچے کے ہاتھ میں آگ، ماچس یا مٹی دینا پسند نہیں کرتیں اسی طرح اللہ تعالیٰ ہمارے ہاتھ میں ناکارہ اور بے مقصد چیزیں دینا پسند نہیں کرتا۔''

دھیرے دھیرے امی کی سرگوشی کان میں گونج رہی تھی۔ اعصاب پر چڑھا بے صبری وشکوؤں کا طوفان تھم رہا تھا۔ رات بھی گہری ہو چکی تھی میں جلدی سے اٹھی کچن میں دھرے میلے برتن صاف کئے، فرج میں سالن رکھا، صبح کے لئے آٹا گوندھا، بچوں کا یونیفارم سیدھا کر کے لٹکایا اور وضو کر کے ہاتھ باندھے کھڑی ہوگئی۔ آج شکوے دفن کر آئی تھی تو نماز میں بھی لطف آ رہا تھا۔ ترجمہ ذہن میں دہراتے ہوئے نماز میں غرق تھی۔ لبوں پر سورۃ التین جاری تھی۔ آخری آیت پڑھتے ہوئے میں چونک گئی کسی نے میرے دل پر دستک دی تھی۔

الیس اللہ باحکم الحاکمین o ''کیا اللہ نہیں ہے سب حاکموں سے بڑا حاکم؟''

پھر دوبارہ یہی سوال میں نے قلب سے کیا اور جوابی شکر کا جملہ لبوں پر جاری ہوگیا۔ ''نعم بلیٰ وَانَا مِنَ الشاکرین o (جی ہاں بلکہ میں تو اُس کے شکر گزار بندوں میں سے ہوں) آئندہ میں آپ کی شکر گزار بندی بنوں گی۔ ہمیشہ! کے لئے! پکا وعدہ!

رب سے عہد و پیمان کرتی کب میں سوگئی۔ پتہ ہی نہیں چلا۔

صبح صبح اسکول کی پکار! اُس سے پہلے رب کی پکار! دونوں سے نبرد آزما ہونے کے بعد اب میں تھوڑی فارغ ہوئی تو گیلری میں آ کھڑی ہوئی۔ ربِ تعالیٰ اپنے بھرپور جلوؤں کے ساتھ آموجود ہوئے۔ وسعتوں بھرا روشن آسمان، چمکتا سورج، بنا کسی سہارے کے اڑتے ہوئے پرندے، جھوم جھوم کر اللہ ہو پڑھتے ہوئے درخت اور رنگ برنگے پھولوں کی ملی جلی خوشگوار مہک! میں اکثر فارغ ہو کر یہاں کھڑی ہو جاتی اور رب کے جلوؤں میں گم رہتی۔

بھاری موٹے جاگرز کی آواز نے توجہ سیڑھیوں کی طرف کھینچ لی۔ میرے گھر آنے کی سیڑھیاں باہر کی جانب نکلی ہوئی تھیں۔ ''اللہ اکبر'' پڑھتا کوئی بہت مشکل سے اوپر میرے گھر کی طرف آ رہا تھا۔ اور میرے دل نے کہا کہ یہ میری ماں ہی ہو سکتی ہے۔ سالوں سے امی کے گھٹنے میں تکلیف تھی۔ ڈاکٹر نے بالکل سیڑھیاں چڑھنے کو منع کر رکھا تھا۔ مگر بیٹی کو نہ دیکھیں تو آنکھیں کیسے ٹھنڈی رہیں۔

''ٹن......ٹن......ٹن......'' بیل بجی۔ میں نے مسکرا کر دروازہ کھولا۔ امی کا سانس پھول رہا تھا۔ میں نے جلدی سے ٹھنڈا پانی گلاس میں ڈالا۔

''ارے امی......! آپ اوپر کیوں چڑھیں اب رات کو پاؤں میں درد ہوگا؟''۔

’’اللہ کا شکر ہے بیٹا! اِن جوتوں میں فوم لگا ہے۔ آرام رہتا ہے۔ بیٹا ہاتھ پیر چلتے رہنے کے لیے بنے ہیں، بس ان کو کام کرتے رہنا چاہیے۔‘‘ وہ اب مسکرا رہی تھیں۔ کوئی شکوہ، ناشکری کے کلمات نہیں بس صرف شکر ہی شکر۔

’’یہ لو بیٹا! یہ مچھلی! تم کو بہت پسند ہے ناں!‘‘ وہ پرس سے ایک بھاری شاپر نکالتے ہوئے بولیں۔ ’’شکریہ امی! ‘‘بس اپنا خیال رکھا کریں‘ میں ممنون سی ہوگئی۔ ’’امی نہ جانے کب رب میرے نصیب کھولے گا؟‘‘ حسبِ معمول شکوے مری زبان سے ٹپک رہے تھے۔

’’نہیں بیٹا! ایسے نہیں کہتے! ابھی بھی ہمارے ہاتھ رب کی ڈھیروں نعمتوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ اُن پر شکر کرو۔‘‘ امی نے پیار سے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ’’بیٹا! اصل شکر تو وہ ہے جو بندہ اس چیز پر کرے جو اسے میسر نہیں۔ جو نعمتیں مل گئیں جن سے وہ فائدہ اٹھا رہا ہے اُس پر شکر ادا کرنا کیسا؟‘‘ امی نے آج شکر کا عجیب مفہوم بتانا شروع کیا۔ میرا تجسس برقرار تھا‘‘ جن چیزوں کی ہمیں آرزو ہو کہ وہ ہمیں مل جائیں۔ ہم رزانہ دعا بھی کریں مگر وہ نہ ملیں تو ان پر جلنے کڑھنے کی بجائے، اس پر بھی رب کا شکر ادا کرنا سیکھو۔ اس طرح چیزوں کی محبت کی جگہ رفتہ رفتہ رب کی محبت قائم ہو جائے گی۔ چیزوں کو تو اپنے وقت پر ملنا ہے مگر ہم رب کی محبت اور اس کی رضا کو پہلے حاصل کر سکتے ہیں۔‘‘ ’’ہاں امی! یہ تو واقعی بہت اہم بات سمجھائی آپ نے۔‘‘ میں ایک دم ہلکی پھلکی ہوگئی۔ میں نے واقعی اس بات کو بالکل سچ پایا۔

بس ایک بار اللہ تعالیٰ کو اپنا دوست و غمخوار اور مددگار مان لیجیے۔ پھر اِس سوچ کے کمالات دیکھیے۔ دل کی ہوس ختم، اس کی جگہ ڈھیروں اطمینان و سکون، غم و حزن ختم اس کی جگہ عبادات کا لطف و مزہ۔ کائنات کے جلووں میں چھپا رحمٰن ہی تو ہے......رنگوں سے سجی کائنات رحمٰن ہی کا تو عکس ہے......وہ جو دل کی دھڑکنوں میں بسا ہوا ہے۔

ربی تعالیٰ بس تو ہمیں اپنے نور کا کچھ حصہ ہدایت کی صورت میں عطا کر دیجیے۔ ہدایت کا نور......نماز کا نور......قرآن کا نور اور آخرت کی زندگی کا حقیقی شعور......جو جو آسائشیں اس دنیا میں نہ مل سکیں آخرت میں وہ ہمارے قدموں میں ہونگی۔

☆......☆......☆



# نصرت محمود قریشی

## ’الحکم الحکیم‘

الازھری کہتے ہیں ’’الحکم، الحکیم اور الحاکم اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں میں سے ہیں۔ معانی کے اعتبار سے یہ تینوں صفات قریب قریب ہیں۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ اس کا یہ تینوں نام اختیار کرنے سے کیا ارادہ ہے۔ مگر ہم پر فرض ہے کہ ہم ان سب پر پورا ایمان لائیں کیونکہ یہ اس کے نام ہیں۔‘‘

اللیث کہتے ہیں ’’اللہ تعالیٰ ہی الحکم ہے‘‘

ابن اثیر کہتے ہیں: ’’اللہ تعالیٰ کے ناموں سے الحکم اور الحکیم ہیں اور دونوں کا مطلب ہے ’الحاکم‘ یعنی وہ جو حکومت کا مالک ہے۔ سب چیزوں اور باتوں کا فیصلہ کرتا ہے اور ان کے لیے قوانین وضع کرتا ہے قرآن حکیم کی آیت **قَدْ حَكَمَ بين العباد** (40:48) کے مطابق حَکَمَ کا مطلب ہے ’عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنا‘ **ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ** (22:52) کے مطابق حَکَمَ کا مطلب ہے مضبوطی عطا فرمانا۔ یہ بھی کہا گیا کہ الحکیم کا مطلب ہے ’’حکمت والا‘‘ اور حکمت کا مطلب ہے اعلیٰ ترین علوم کے ذریعے اعلیٰ اور افضل ترین اشیاء کا علم، دانائی اور معرفت‘‘ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ’’**وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكما**‘‘ (5:50) یعنی ’’حکمت، علم و معرفت، دانائی، عدل و انصاف، مضبوط کرنے اور حکومت و اقتدار قائم کرنے میں کون اللہ سے بہتر ہو سکتا ہے؟‘‘

’الحکیم‘ طبیب کو بھی کہتے ہیں جو بعض اوقات مرض کے علاج کے لیے کڑوی دوا بھی استعمال کرتا ہے۔ لیکن ہم ظلوماً جھولاً انسان اکثر اوقات اس الحکم اور الحکیم کے کئے ہوئے فیصلوں اور اس کی تجویز کردہ دوا یا علاج کو نہایت کڑوا کسیلا سمجھ کر ناک بھوں چڑھاتے ہیں (معاذ اللہ) حالانکہ وہ ’’خیر الحاکمین‘‘ بہترین عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنے والا حاکم اور ’احکم الحاکمین‘ ہے۔

☆......☆......☆

نصرت یوسف

# نقشِ یقین

ہفتہ بھر اسی سخت کیفیت میں گزر گیا۔ گھر میں امی ابو کے لاکھ پوچھنے پر بھی میں نے انہیں کچھ نہ بتایا۔ وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔ بے اختیار اور بے وزن لوگ تھے ہم۔ حالانکہ کون جانے کون اصل میں بے اختیار ہے اور کون بااختیار۔ ظاہری فقیری میں بھی کبھی بادشاہی وجود اور طاقت پنہاں ہوتی ہے۔ اور ظاہری بادشاہی میں بھی بے بسی کا ذائقہ گھلا ہوتا ہے۔ جب میرے افسردہ وجود سے اپنے سوالوں کا جواب میرے والدین کو نہ ملا تو ابو نے کچھ کہے بغیر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا، اپنے بازو میرے شانوں پر پھیلائے۔ ان کی خوشبو میرے نتھنوں میں جا کر مجھے وہی چار برس کا سا بچہ بنا گئی جو ابو کے دلاسہ دینے پر دنیا کو ٹھوکر لگا کر اٹھ کھڑا ہوتا تھا۔

''ہم ہمیشہ بند دروازے پر نگاہ جمائے رہتے ہیں سعد اللہ، کئی اور در ہمارے لیے تمہارے کھول دیئے جاتے ہیں بس نگاہ ہٹانے کی دیر ہے۔ دیکھو تو سہی یہ لفافہ کیسا ہے۔ میری دکان کے پتہ پر تمہارے نام سے آیا ہے''

ابو کی آنکھیں لو دے رہی تھیں۔ میرے لفافہ تھامنے سے پہلے کسی ہاتھ نے اسے بڑھا کر پکڑ لیا۔ چونک کر میں پلٹا تو امی کھڑی تھیں۔

''مجھے دکھایئے'' پہلے۔ ابو بے ساختہ مسکرا گئے جب کہ مجھے بے چینی تھی کہ آخر یہ کیسا لفافہ ہے۔

''لو پڑھو!'' امی نے سرسری نظر ڈال کر لفافے میں سے نکلا کاغذ مجھے تھما دیا۔ اب کے ان کے چہرے پر روشنی سی اتر آئی تھی۔ اگلے ہی لمحے میں بار بار ایک ہی سطر پڑھ رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے یقین نہیں آ رہا کہ جو لکھا ہے وہ درست ہے۔ کمپیوٹر سے وابستہ بین الاقوامی کمپنی نے شہر میں موجود اپنی برانچ میں میری انٹرن شپ کے لیے ڈالی گئی درخواست منظور کر لی تھی۔ اس خط میں واضح کیا گیا تھا کہ یہ انٹرن شپ بہت چنیدہ لوگوں کو دی جاتی ہے جن کا تعلیمی ریکارڈ کسی معیاری جامعہ سے وابستہ ہو لیکن مجھ کو اس لیے دی گئی ہے کہ میری سفارش ان کی کمپنی سے وابستہ کسی اہم شخص نے کی تھی۔ یہ میرے لیے انکشاف تھا کہ کون میرا خفیہ کرم فرما ہے جو پردے میں رہ کر مجھ پر یہ نوازش کر چکا ہے۔ میں ششدر تھا جب کہ میرے والدا تنے پرسکون جیسے یہ سب ان کے لیے غیر متوقع نہ ہو۔ ابو جی آپ کو حیرت نہیں ہوئی کہ کون ہے ہمارا خیر خواہ؟'' ''وہی جو عسر کو یسر میں تبدیل کر دیتا ہے، اصل تو وہی ہے باقی سب اس کے پیدا کردہ وسیلے'' ابو کے جواب میں اس قدر تشکر اور یقین تھا کہ مجھے لگا ان کی لہریں میرے دل کو بھی گرما رہی ہیں۔

اور پھر زندگی نے راتوں رات میرے لئے نیا ہی رخ اختیار کر لیا۔ میرے لیے نہیں بلکہ میرے پورے گھرانے کے لیے۔ ابو کی واچ مکینک کی چھوٹی سی دکان جس میں مشکل ایک شوکیس اور دو انسانوں کے علاوہ کچھ اور زمین پر صرف قدم رکھنے کی گنجائش تھی، پڑوسی آئس کریم والے کو اپنا کام بڑھانے کے لیے اس قدر ناگزیر محسوس ہوئی کہ اس نے بہت عمدہ داموں وہ کھوکھے نما جگہ خرید لی۔ اور اتنے عرصے دونوں کے پڑوس نے اس کو اس بات پر بھی راضی کر دیا کہ تقریبات میں آئس کریم پہنچانے کا کام ابو کے حوالے کر کے ان کے باقاعدہ روزگار کا بھی بندوبست کر دے۔ یہ سب انہونا ہی تھا۔ وہ ایک سخت گیر آدمی کے طور پر اتنی مدت سے پڑوسی تھا۔ لیکن جب عُسر کے یُسر سے تبدیل ہونے کا مخصوص وقت آن پہنچتا ہے تو ظاہری تمام رکاوٹیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔ سو یہی ہوا، اور ہمارے حالات بہت حد تک اطمینان کی ڈگر پر رواں ہو گئے۔

دکان سے ملے پیسے کو ہم نے آبادی سے دور نئی آباد شدہ کالونی میں گھر کی خریداری پر لگایا تا کہ رقم محفوظ ہو جائے۔ حالانکہ ایسی جگہوں

پر قبضے کا خطرہ ہوتا ہے۔ لیکن یہاں بھی میرے والد کا یقین تھا کہ اگر کچھ برس کے لیے فلاں رشتہ دار کو یہ گھر رہائش کیلئے دے دیا جائے تو ان کا بھی بھلا اور ہمارا بھی کام ہو جائے گا۔

''اور اگر وہ بھی قبضہ کر کے بیٹھ گئے تو؟'' میں خاصا جھنجھلا گیا۔

''اول تو وہ رشتے میں میرا بھائی ہے، اس وقت بہت پریشان ہے، اگر میں نے وسائل رکھتے ہوئے بھی اس کی مدد نہ کی تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ جو نعمتیں مجھے عطا کی گئی ہیں، مجھے ان سے محروم کیا جا سکتا ہے۔ باقی رب بندے کے لیے بہت کافی ہے۔''

میں ہمیشہ کی طرح اس بار بھی سوچ کر رہ گیا کہ اللہ نے عبدالقادر کو جو کہ میرے والد محترم ہیں، بہت سی حسوں سے محروم رکھا ہے یہ واقعی باکمال ہیں نہ ان کو خدشات گھیرتے ہیں اور نہ دور اندیشی کی فکر ہے۔ دوسرے جملے پر مجھے خاصی کوفت بھی ہوتی تھی۔ اور پھر زندگی کچھ یوں رواں ہوئی کہ پلٹ کر دیکھنے کا بھی موقع نہ ملا۔

اپنے کرم فرما کا نام جان کر مجھے شدید حیرت ہوئی۔ وہ رضوان خان تھے جنہوں نے پہلے مجھے اپنی کمپنی سے نکال کر جھٹکا دیا اور پھر وہی تھے جو میرے لیے سفارش کا سبب بنے۔ یہ مجھے نئی جگہ پہنچنے کے ایک دو دن بعد ہی معلوم ہو گیا تھا۔ میں انٹرن شپ پر کیا گیا، دنیاوی مہارتوں اور عمدہ ذرائع علم اور مواقع قطار در قطار میری پہنچ میں آتے چلے گئے۔ زندگی کی رعنائیاں اُبھرتی چلی گئیں اور کامیابیاں میرے قدم چومتی گئیں۔ میرا یقین خود بخود پختہ ہوتا گیا کہ تسبیح کے دانوں پر انگلی پھیرتے کتنے ہی بار لب ہلا لو حالات نہیں بدلتے۔ حالات مثبت یقین اور ممکنہ وسائل کے استعمال سے ہی بدلتے ہیں۔ میرے حالات میرے ماں باپ کے بلند تر مثبت یقین اور موجود توانائی کے مثبت استعمال سے بدلے تھے۔ ورنہ عسر سے یسر اور یسر سے عسر آتے کچھ لوگوں کی زندگی میں وقفہ بہت قلیل ہوتا ہے۔ زندگی میں ان کو نعمتیں عطا کی جاتی ہیں لیکن ناشکری اور منفی اندازِ فکر ان کی نعمتوں کو برف کے مانند گھلا ڈالتا ہے۔ چاہے ان کو گلیشیئر ہی عطا کیا گیا ہو، منفی حرارت تیزی سے اس کو ختم کر دیتی ہے۔ میرے والد عبدالقادر اور میری ماں سمیعہ ناز کے جتنے بھی وسائل تھے صحت، اختیار اور فکر کے انہوں نے اس کو ممکنہ حد تک ہمیشہ استعمال کیا۔ چاہے ان سے نتیجہ مٹر کے دانے برابر آیا مگر شکر گزاری نے بالآخر اس مٹر کے دانے کو پھلی میں تبدیل کر دیا جس میں اس جیسے کئی دانے بھرے تھے۔ طاقتور اور سرسبز!

اور پھر وہی ہوا جس کا مجھے خدشہ تھا۔ ابو کی نیکی میرے حساب سے ان کے گلے پڑ گئی۔ میری طرف سے ان کو اطمینان ہو چکا تھا لیکن اب چھوٹے بہن بھائیوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے اخراجات کی فراہمی کا مسئلہ آیا تو اس عزیز سے گھر خالی کرا کے کرائے کی آمدنی کا منصوبہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ ان صاحب نے وہی کیا جو عموماً ہی رویہ ہوتا ہے۔ ٹال مٹول اور بہانے! مجھے لگا ہمارا یُسر بس پھر عُسر میں تبدیل ہونے والا ہے۔ گھر جس میں ہم رہ رہے تھے اتنا خستہ ترین ہو چکا تھا کہ حاصل ہو جانے والی کامیابیوں کے ساتھ اس کو اپنی شناخت میں شامل رکھنا کٹھن بن گیا تھا۔ اس کو بدلتے یا تعلیم پر سرمایہ کاری کرتے۔ زندگی ایک بار پھر مشکل ترین سی ہونے لگی۔ برف کا ڈلا تیز دھوپ تلے آ چکا تھا۔ نعمتوں کی ٹھنڈک لگتا تھا گھلتی جا رہی ہے۔ نہیں گھلا تو میرے والدین کا توکل اور اعتماد اپنے رب کی رحمت پر۔ وہ مجھے کہتے کہ پہلی وحی کے بعد جب ہمارے پیارے نبیؐ اضطرابی حالت میں تھے تو حضرت خدیجہؓ نے انہیں یہ بھی کہہ کر تسلی دی تھی کہ ''اللہ آپ کو ہرگز رسوا نہ کرے گا۔ آپؐ صلہ رحمی کرتے ہیں، درماندوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، تہی دستوں کا بندوبست کرتے ہیں، مہمان کی میزبانی اور حق کے مصائب پر اعانت کرتے ہیں'' (الرحیق المختوم ص ۹۹) اس لیے مجھے یقین ہے کہ میرا اللہ مجھے اور میرے کنبے کو بھی ضائع نہ کرے گا، میں نے بھی محض اس کی رضا کے لیے اس غریب بھائی کی مدد کی تھی۔

یہ جواب لمبے عرصے کے لیے نہ سہی بہر حال پین کلر کا سا کام کر ہی جاتا ہے جو کچھ مدت کے لیے درد کو رفع کر دیتی ہے۔ اور پھر جب کوئی مسئلہ سامنے آتا جس کا ممکنہ حل وہ گھر ہو سکتا تھا جو ہمارے قبضے سے فی الحال نکل چکا تھا تو پھر القادر کے بجائے میری سوچوں کا رخ عبدالقادر کی ''سادگی بھرے یقین'' پر ہو جاتا جس نے یہ دن دکھائے تھے۔ ان غلط

سمت سے کئی اور ممکنہ راستوں کی طرف رخ ہو ہی نہیں پاتا جو شاید ہمیں اس سے کہیں بڑھ کر فیض یاب کر دیتے۔

انٹرن شپ ختم میری پڑھائی کے ساتھ ہی ہوئی تھی۔ کمپیوٹر نیٹ ورکنگ میں کئی جہتوں سے میری مہارت اعلیٰ پایہ تکمیل تک تو نہیں عمدہ ترین ہو چکی تھی اس کا اعتراف مجھ کو ملنے والی اسناد سے بخوبی ظاہر تھا۔ اسی کمپنی نے مجھے فوراً ہی پرکشش ملازمت بھی دی اور معاشرے میں مقام بھی لیکن میں غلط کہہ گیا۔ اس کمپنی کو اللہ نے اپنی رحمت کا وسیلہ بنایا میرے لیے اور میرے گھر والوں کے لیے۔ یہ بات مجھ سے کس نے کہی؟ آپ کو سن کر حیرت ہو گی کہ یہ بات مجھے رضوان خان نے کہی۔ رضوان کا بھتیجا جو ہر لحاظ سے مجھ سے بہتر اور عمدہ ریکارڈ رکھتا تھا، کمپنی نے اس کو مسترد کر کے مجھے صرف اس لیے رکھا کہ سلیکشن بورڈ کے طاقتور ممبر نے میرے حق میں رائے دی تھی۔ اور اس نے یہ رائے کیوں دی آخر؟ کسی کو نہ پتہ تھا میں نے بھی جاننے کا زیادہ تردد نہ کیا اور رب کی عطا کردہ لاتعداد نعمتوں سے جھولی بھرنے لگا۔ ہاں اب عسر یسر کا فلسفہ مجھے کوفت کے بجائے طمانیت لگنے لگا تھا۔ ابو، امی کا سا سکون اپنے اندر بھی آتا لگتا تو دل بے اختیار سجدہ ریز ہو جاتا کہ شکر ہے قدم بغاوت وسرکشی کی راہ پر بگٹٹ بھاگنے سے بچا لیے گئے۔ اپنے والد عبدالقادر کے باکمال ہونے کا اعتراف میں نے ہمیشہ کی طرح پھر کہا کہ واقعی رب نے انہیں منفی حسوں سے محروم ہی رکھا ہے۔ ورنہ ہماری زندگیاں گنجلک ہی ہو جاتیں۔ اور میری ماں لاجواب تھیں کہ میاں کے کمال اعتماد کو انہوں نے لاجواب طریقہ پر سنبھالے رکھا۔

آج جب دنیا مجھے سراہتی ہے، لوگ مجھ سے تعلق جوڑنا فخر سمجھتے ہیں، میرے خاندان کی نیک نامی کو مانتے ہیں، ہماری کمی، کوتاہی کو بآسانی نظر انداز کرتے ہیں تو اس کے پیچھے عبدالقادر کا کامل یقین ہی ہے۔ اور عبدالقادر کو عبدالقادر بنانے میں رب کی رحمت کے بعد اس عورت کا ہاتھ تھا جس نے اس کو جنم دیا۔ اس مرد کا سایہ تھا جس نے خود مشقت اٹھا کر سرد وگرم سے پناہ عطا کی۔ ایسا باپ کے علاوہ کون کرتا ہے۔ بھلا ...... ان تمام بہن بھائیوں کی محبتیں تھیں جنہوں نے دل جوڑے رکھے اور پھر جب سمیعہ ناز کے ساتھ جوڑا بنا تو سمیعہ ناز نے عبدالقادر کو عبدالقادر ہی رہنے دیا۔ اس لیے میں اپنی ماں کو لاجواب کہتا ہوں کہ انہوں نے میرے باپ کو دائیں بازو سے بائیں کی جانب مجال ہے کبھی دھکیلا ہو۔ ورنہ شاید آج میں وہاں نہ ہوتا جہاں کھڑا ہوں۔ زندگی کی حقیقی مسرتیں میں انہی دو شخصیتوں کے نام سے موسوم کرتا ہوں جو اپنے کنبے کو عسر یسر کا فلسفہ سکھا گئے۔

میرے دائیں بائیں میرے دونوں جوان بیٹے کھڑے ہیں اور سامنے تازہ قبر ہے جو کچھ گھنٹوں قبل ہی تیار ہوئی تھی۔ میں نے اپنے کندھوں پر اس کے مکین کو دوسروں کے ساتھ مل کر یہاں تک پہنچایا تھا۔ اپنے باپ عبدالقادر کو لحد میں اتارتے بے آواز آنسو گر رہے تھے۔ مگر مجھے رب کی رحمت سے امید ہے کہ ان کا سکھایا عسر یسر کا فلسفہ ان کے حق میں قبول کر کے ان کی بہترین قدردانی کی جائے گی۔

سبز ٹہنی کے نرم پتوں کو بے اختیار میں نے چھو کر دیکھا اور اپنے دونوں بیٹوں کو کاندھوں سے تھام کر واپسی کے لیے مڑ گیا کہ زندگی کی امتحان گاہ میں ابھی میرا امتحانی وقت باقی ہے کہ میں نے اپنی رعیت کو کیا فلسفہ حیات دیا!

☆......☆......☆

ربیعہ ندرت

# میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

میرے میاں سابق فوجی ہیں۔ چونکہ میری زندگی کا بیشتر حصہ ان کے ہمراہ بسر ہوا ہے لہٰذا اپنے سالہا سال کے عمیق مشاہدے اور تجربے کی بناء پر میں پورے وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ انسان اگر ایک دفعہ فوجی بن جائے تو ریٹائر ہو جانے کے بعد وہ سابق فوجی تو ہو سکتا ہے لیکن غیر فوجی کبھی نہیں ہوتا۔

میرے میاں کو پاکستان سے انتہائی محبت ہے۔ ان کا خیال ہے کہ شرعی اور اخلاقی حدود کی طرح ملک کی سرحدیں بھی عبور کرنے کے لیے نہیں ہوتیں بلکہ یہ تو صرف اس لئے بنائی جاتی ہیں کہ چوکس ہو کر ان پر پہرہ دیا جائے، دشمن پر گہری نظر رکھی جائے اور ہر موسم میں، ہر حال میں، ہر قیمت پر اس کی دراندازی کو روکا جائے۔ اس لئے ہمارے بچے جب بھی اصرار کرتے ہیں کہ ہم کچھ عرصے کے لئے بیرون ملک ان کے پاس چلے جائیں تو میرے میاں فوراً حامی بھرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''فکر نہ کرو۔ میں بہت جلد تمہاری ماں کو تمہارے پاس بھیج دوں گا۔''

اس کے بعد وہ خالصتاً فوجی لہجے اور سیاسیانہ شان کے ساتھ مجھے حکم دیتے ہیں۔

''بیگم! اپنی تیاری کر لو۔ ایک دو روز میں تمہارا ٹکٹ لے آؤں گا اور تمہیں جہاز میں بٹھا دوں گا۔'' میں اپنی اوقات کو بھول کر فوج کے سامنے ڈٹ جاتی ہوں۔

''میں کوئی بوری ہوں جسے آپ جہاز میں لاد دیں گے۔ میں کہیں نہیں جا رہی۔ یہیں رہوں گی۔'' وہ سنی اَن سنی کرتے ہوئے ایک سپاہی سے مضبوط اور فیصلہ کن لہجے کے ساتھ حکم صادر کرتے ہیں۔

''بچے بلا رہے ہیں۔ تم بھلا کیوں نہیں جا رہی۔ تمہارے تو اچھے بھی جائیں گے۔''

میں حیرت سے سوچتی ہوں کہ یہ کمال کے بچے ہیں، جنہوں نے فوج کو اپنے پیچھے لگا رکھا ہے ایک ہم ہیں کہ عرصہ دراز سے ہانپتے کانپتے، آس پاس سے بے خبر، اندھا دھند فوج کے پیچھے بھاگ رہے ہیں اور ایک فوج ہے کہ ہماری کمزوریوں سے بے نیاز سرپٹ بھاگتی ہی چلی جا رہی ہے۔

میں چند لمحے سوچنے کے بعد پسپا ہوتے ہوئے آخری کوشش کرتی ہوں۔

''ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو کہ میرے جانے کے بعد آپ کے لئے پرہیزی کھانا کون بنائے گا؟ آپ کی دوا کا خیال کون رکھے گا؟ آپ کی ہر آواز کے جواب میں کون لبیک کی صدا بلند کرے گا؟ آپ کے کچھ کہے بغیر آپ کے وجود میں پھیلی ہوئی دکھ اور تکلیف کی حکایات و کیفیات کو کون جان جایا کرے گا؟ آپ کے مسرور چہرے کو دیکھ کر کون آپ کی خوشی میں شریک ہوا کرے گا؟ آپ کے حرف طلب کی ادائیگی سے پہلے کون آپ کی روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی ضروریات کو بروقت پورا کرنے کی تگ و دو میں مگن رہے گا؟ آپ کی خاموشی کے اشارے، آنکھوں کے استعارے اور لہجے کے دھارے کے مفہوم کون سمجھا کرے گا؟ غرض میرے بغیر آپ کے گلشن کا کاروبار ماند پڑ جائے گا اور پھر میری غیر حاضری کے دوران آپ پر کیا کیا نہ بیت جائے گی۔ یہ آپ کو نہیں معلوم۔ اس لئے فیصلہ کرنے سے پہلے سوچو تو سہی۔''

حسب معمول اور حسب سابق میری آواز صدا بصحرا ثابت ہوتی ہے۔ ان کا دل نہیں پسیجتا اور وہ اپنے صادر کردہ حکم میں رد و بدل پر آمادہ نہیں ہوتے۔

ان لبوں نے نہ کی مسیحائی
ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

کچھ دن کے بعد ان کا حکم نافذ العمل ہو جاتا ہے اور میں گھر سے رخصت ہو کر ان کے ساتھ ایئر پورٹ کی جانب محوسفر ہو جاتی ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ ایک دفعہ پھر ان سے کہوں کہ:

''اجی سنیے! ابھی بھی وقت ہے۔ مجھے روک لیں۔''

لیکن انا آڑے آتی ہے اور میں یہ سوچ کر بھی خاموش رہتی ہوں کہ:

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

وہ اپنے جذبات کو چھپاتے ہوئے سرد لہجے میں کہتے ہیں،

''دیکھو! وہاں زیادہ دیر رہنے کی ضرورت نہیں۔ بس پندرہ بیس دن رہ کر لوٹ آنا''

میں دل میں سوچتی ہوں۔

لو جی اللہ اللہ کر کے اب ناز اٹھوانے کی میری باری آئی۔ اس موقع پر بھلا میں چپ کیوں رہوں۔

ہمنوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں

میں اٹھلاتے ہوئے کہتی ہوں۔

''کیوں جی، میں کیوں واپس آؤں پندرہ بیس دن کے بعد۔ آپ کی مرضی سے جا رہی ہوں اور اپنی مرضی سے واپس آؤں گی۔ ابھی سے بتائے دیتی ہوں کہ چار پانچ ماہ تو کہیں نہیں گئے۔ ورنہ ابھی بھی وقت ہے اب بھی سوچ لو اور مجھے روک لو۔ دیکھو! میرا تو کچھ نہیں بگڑے گا، بس آپ کا بھلا ہو جائے گا۔''

ان کے لہجے کی تیزی غائب ہو جاتی ہے اور وہ پست آواز میں کہتے ہیں۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا کیونکہ بچے کہتے ہیں۔''

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو جاتے ہیں۔ باقی سفر یوں کٹ جاتا ہے جیسے کار میں کوئی موجود ہی نہ ہو جیسے وہ خود بخود چلتی چلی جا رہی ہو۔ انجان راستوں پر، نامعلوم منزلوں کی جانب، ڈرائیور کے بغیر، مسافر کے بغیر۔ جیسے تاحدِ نظر، تا حد مکاں خلا ہی خلا ہو، دھند ہی دھند، کہر ہی کہر، غبار ہی غبار، دھول ہی دھول، گرد ہی گرد۔

میرے ذہن میں ایک پرانا گانا معمولی سے ردوبدل کے ساتھ گونج رہا ہے۔

چپ چپ بیٹھے ہو ضرور کوئی بات ہے
کیسی ملاقات ہے یہ کیسی ملاقات ہے

ایئر پورٹ کی حدود میں داخل ہو کر وہ گاڑی روک کر اس کی ڈگی کھول کر میرا سامان نکالتے ہیں اور اسے ٹرالی پر رکھ کر ہم ایئر پورٹ کی عمارت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اب وہ مجھ سے نظریں چار نہیں کر پا رہے۔ بے مقصد دائیں بائیں دیکھتے چلے جا رہے ہیں۔ جیسے میں ان کی چوری پکڑ لوں گی۔ جیسے ان کی کمزوری عیاں ہو جائے گی۔ سب کچھ جانتے ہوئے میں بھی لب وا نہیں کرتی۔

ہم ہنس دیئے، ہم چپ رہے، منظور تھا پردہ تیرا

وہ ٹرالی میرے حوالے کر کے بھاری قدموں کے ساتھ لوٹ جاتے ہیں۔ میں بھی بوجھل دل کے ساتھ لاؤنج کی طرف بڑھ جاتی ہوں۔ کچھ ہی دیر کے بعد جہاز کی پرواز کا اعلان ہو جاتا ہے۔ یہ اعلان سنتے ہی لاؤنج میں آرام دہ صوفوں پر ہم خوابیدہ مجسمے نما لوگوں میں گویا زندگی کی رو دوڑ جاتی ہے اور وہ حرکت میں آ جاتے ہیں۔ میں بھی ان کے ہمراہ لاؤنج سے باہر نکل کر جہاز کی سمت چل دیتی ہوں۔ میرے قدم لحہ بہ لحہ جہاز کی طرف بڑھ رہے ہیں جبکہ لگاوٹ اور انجانے اندیشے میرے دامن کو پیچھے کی طرف کھینچتے ہوئے بزبانِ حال کہہ رہے ہیں۔

لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

لیکن جیسا کہ تاریخ کی روشنی میں ازل سے ہوتا آیا ہے کہ ایسے حالات میں زمینی حقائق ہمیشہ غالب آ جاتے ہیں، بالکل اسی طرح میں بھی انجانے اندیشوں کو دامن میں سمیٹ کر یہ کہتے ہوئے جہاز میں بیٹھ جاتی ہوں۔

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

ساڑھے 14 گھنٹے کی طویل، صبر آزما اور تھکا دینے والی پرواز کے

بعد جہاز ٹورنٹو کے ہوائی اڈے پر اتر گیا۔ سب مسافروں کے چہروں پر تھکاوٹ اور ماندگی کے آثار نمایاں ہیں۔ لیکن جونہی ایئر پورٹ پر مسافروں کی نظریں اپنے عزیز واقارب سے دوچار ہوتی ہیں، ان کے رگ و پے میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ اپنے بیٹے کو دیکھ کر میری آنکھیں بھی ٹھنڈی ہو جاتی ہیں اور میں اس کے ہمراہ بذریعہ کار مونٹریال اپنی بیٹی کی رہائشگاہ تک جا پہنچتی ہوں۔

دن پر لگا کر اڑ رہے ہیں۔ مہینہ ہونے کو آیا ہے۔ صبح و شام میرے میاں جی کا فون آتا ہے۔ ہر دفعہ پوچھتے ہیں۔

''واپسی کا کیا پروگرام ہے؟''

میں دل ہی دل میں یہ سوچ کر خوش ہوتی ہوں کہ شکر ہے پاکستان میں کوئی ہے جو مہر بہ لب لیکن دیدہ و دل وا کئے میرا انتظار کر رہا ہے۔ میں بظاہر بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہتی ہوں۔

باغِ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں

کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

''جناب عالیٰ! ابھی تو مجھے یہاں آئے ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں۔ فی الحال میرا واپسی کا کوئی ارادہ نہیں۔ میں یہاں بے حد مصروف ہوں۔ مثلاً روزانہ سورج کو چڑھتے ہوئے دیکھنا، چاند کو ابھرتے ہوئے دیکھنا، صاف شفاف، بے کنار، وسیع نیلگوں آسمان پر بے شمار جگمگ جگمگ کرتے ستاروں کو گننا، یخ بستہ ہواؤں کو محسوس کرنا، اجلی اجلی، نکھری نکھری سفید برف کو دھنکی ہوئی روئی کے مانند چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ کر قطرہ قطرہ لڑیوں کی شکل میں قطار اندر قطار لپکتے جھپکتے زمین بوس ہوتے دیکھنا، بہتے ہوئے پانیوں کے جاہ و جلال کو دیکھنا، اس کے حسنِ خیال کو دیکھنا، اس کی خوبی کمال کو دیکھنا، ٹنڈ منڈ درختوں پر کومل پتے نکلتے ہوئے دیکھنا، بچوں کے گلرنگ تمتماتے ہوئے چہروں کو دیکھنا، خوش رنگ، خوش گلو پرندوں کو دیکھنا غرض میں کوئی فارغ تھوڑی ہوں کہ جھٹ پٹ چلی آؤں۔ آپ کی تکرار کے سامنے انکار تو نہیں کرتی بلکہ اقرار کرتی ہوں کہ چلی آؤں گی، ضرور چلی آؤں گی لیکن ذرا دم تو لینے دو۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے؟

وہ سنی اَن سنی کرتے ہوئے جرنیلی حکم صادر کرتے ہیں۔

''بس بہت ہو گیا، اب چلی آؤ۔''

اٹھ کہ اب بزمِ سخن کا اور ہی انداز ہے

میں بھی ان کے بدلتے ہوئے لہجے کے مزے لیتے ہوئے کہتی ہوں

''میں نے آپ سے کہا تھا نہ کہ مجھے روک لیں لیکن آپ ہمیشہ ایسے کاموں میں دیر کر دیتے ہیں اور وقت آپ کے الفاظ کی ادائیگی کا انتظار کئے بغیر تیزی سے گزر جاتا ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ اگر بروقت منہ سے موزوں الفاظ جھڑیں تو وہ پھول اور پھر وہی سندِ قبول ورنہ وقت کے ڈھل جانے کے بعد نری دھول اور ناقابلِ قبول۔ میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ:

ہم کو باغ میں جانے نہ دیجیو......ورنہ

ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

لیکن آپ نے میری ایک نہیں سنی اور پھر ہونی ہو کر رہی۔

اب ہمیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر

وہ کہنے لگے

''کیا مطلب؟''

میں نے کہا:

''میرا مطلب ہے کہ میری عادت ہی ایسی ہے کہ:

حضرتِ داغ جہاں بیٹھ گئے، بیٹھ گئے

میرا خیال ہے کہ اب حضرت کو اٹھتے اٹھتے شاید دو تین ماہ لگ جائیں گے۔ اس لئے میرا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ آپ صبر سے انتظار کا دامن تھام لیں۔

اب اداس پھرتے ہو سردیوں کی شاموں میں

اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں

وہ فوراً جھلا کر کہتے ہیں

''بات اداسی کی نہیں۔ صرف عادت کی ہے یا شاید ضرورت کی۔''

میرے اندر کی سرکش عورت بیدار ہو جاتی ہے

''بھلا کیسے نہیں مانتے آپ۔ لو آج آپ سے منوا کر ہی دم لوں گی۔''

میں کہتی ہوں

''آپ اسے عادت اور ضرورت کہتے ہیں۔ میں اسے اداسی کہتی ہوں۔ بات تو ایک ہی ہے نہ ناک کو سیدھے سبھاؤ پکڑو۔ کیوں بازو کو سر کے پیچھے سے گھماتے ہوئے ناک کو پکڑتے ہو۔''

وہ جواباً کہتے ہیں۔

''تم سے مزید بات کرنا فضول ہے۔ منیب سے بات کرواؤ۔''

میں ریسیور منیب کے ہاتھ میں دے دیتی ہوں۔ وہ اس سے کہتے ہیں۔

''بیٹا ماں کی واپسی کا انتظام کر دو۔''

وہ شوخی سے کہتا ہے

''ابو! آج سے چالیس سال پہلے جب آپ ماں جی کو لینے گئے تھے تو میرے نانا نانی نے بخوشی ان کو آپ کے ساتھ رخصت کر دیا تھا۔ اب آپ پھر ماں جی کو لینے یہاں آ جائیں تو ہم ان کو رخصت کر دیں گے۔''

اس کی بات سن کر فوجی کی خود ساختہ، غیر جذباتی کنکریٹ کی دیوار میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں اور وہ ضبط کرنے کی ناکام کوشش کرنے کے بعد کھلکھلا کر ہنستے ہوئے کہتے ہیں۔

''تیرے کان کھینچنے کی اشد ضرورت ہے۔ تجھے بھی اپنی ماں کی طرح باتیں بنانا آ گیا ہے۔ یک نہ شد، دو شد۔''

وہ بصد اشتیاق کہتا ہے۔

''ابو! پھر آ جائیں نا میرے کان کھینچنے کیلئے۔ میرے کان بھی عرصے سے آپ کے ہاتھوں کے خوشگوار اور محبت بھرے لمس کو ترس گئے ہیں۔''

وہ لمحہ بھر کے لئے خاموش رہتے ہیں۔ پھر رک رک کر دھیمے لہجے میں کہتے ہیں۔

''اچھا دیکھتے ہیں، سوچتے ہیں، کچھ کرتے ہیں۔''

چند لمحے خاموشی طاری رہتی ہے پھر منیب پوچھتا ہے۔

''ابو! کیا آپ کا دل نہیں چاہتا کہ آپ یہاں آ کر کچھ دیر ہمارے ساتھ رہیں؟ آخر کیا وجہ ہے کہ آپ آنا نہیں چاہتے؟''

وہ مختصر سا جواب دیتے ہیں۔

''بیٹا! مجھے پاکستان کی مٹی سے بہت محبت ہے۔ میں اس سے جدا نہیں ہونا چاہتا۔''

منیب فوراً کہتا ہے۔

''یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ ایسا کرتے ہیں کہ ایک تھیلے میں پاکستان کی مٹی بھر کر ساتھ لے آتے ہیں۔'' وہ بے اختیار مسکرا دیتے ہیں۔ میں پھر رشک کے مارے سوچتی ہوں کہ یہ باکمال بچے ہیں جنہوں نے فوج کو اپنے پیچھے لگا رکھا ہے۔ ایک ہم ہیں کہ عرصہ دراز سے ہانپتے کانپتے، آس پاس سے بے خبر، اندھا دھند فوج کے پیچھے بھاگ رہے ہیں اور ایک فوج ہے کہ ہماری کمزوریوں سے بے نیاز و سرپٹ بھاگتی ہی چلی جا رہی ہے۔

اگلے دن منیب دفتر سے واپس آیا تو میں سامان پیک کر رہی تھی۔ اس نے حیرت سے پوچھا ''ماں جی! کہاں کی تیاری ہے؟''

میں نے مختصر سا جواب دیا۔

''واپسی کی''

اس نے پوچھا...... ''لیکن کیوں؟''

جیسے ہماری جون بدل چکی تھی اور ہم گوشت پوست کے بجائے پتھر کے مجسموں میں ڈھل چکے تھے، جذبات واحساسات سے عاری۔

میں نے کہا:

''تمہارے ابو کے سنجیدہ لہجے سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ بات اب مذاق سے آگے بڑھ گئی ہے۔ اس لئے اب واپسی میں ہی عافیت ہے۔ چنانچہ موجودہ حالات کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے میں نے اپنے آپ سے کہا ہے کہ:

اٹھ باندھ کمر کیا ڈرتا ہے

اس نے مسکراتے ہوئے کہا:

''نہیں ماں جی! ابھی آپ نہیں جا رہیں۔ میں ابّو سے بات کرتا ہوں۔

پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے''

لیکن ہوا یہ کہ منیب کی ضد کے سامنے خلافِ توقع فوج نے ہتھیار ڈال دیئے اور منت سماجت پر اتر آئی۔ فوج کی یہ حالت دیکھ کر منیب کی زبان گنگ ہوگئی اور اس نے بمشکل دھیمے لہجے میں صرف اتنا ہی کہا:

''ابو! ماں جی کو واپس بھیجنے کو میرا دل تو نہیں چاہتا لیکن جیسے آپ کی مرضی۔''

منیب کا جواب سنتے ہی انہوں نے خوشدلی سے کہا:

''شاباش! تم سے مجھے یہی توقع تھی۔ اب جا کر اپنی ماں کی واپسی کا ٹکٹ لے آؤ۔'' منیب جا کر میرا ٹکٹ لے آیا۔ میرا دل بوجھل ہو گیا۔ جائے ماندن نہ پائے رفتن جیسی صورتحال ہوگئی۔ منیب کا چہکتا ہوا لہجہ بھی کہیں کھو گیا۔ چند دن برق رفتاری سے گزر گئے اور کوچ کا نقارہ بج اٹھا۔ منیب نے میرا سامان گاڑی میں رکھا اور ہم دونوں ائرپورٹ کی جانب روانہ ہوگئے۔ سارا راستہ کار میں مہیب خاموشی پر پھیلائے چھائی رہی۔ ہم دونوں کے ذہنوں کی سلیٹ پر لکھے گئے سب الفاظ مٹ گئے۔ خیالات روٹھ گئے۔ اظہار کے انداز چھن گئے۔ اور ہم یوں بیٹھے رہے جیسے ہم گونگے ہو چکے تھے، جیسے ہم ایک دوسرے سے روٹھے ہوئے تھے، جیسے بیان کرنے کو کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ جوں توں کر کے سفر کٹا اور میں جہاز میں سوار ہوگئی۔

میں جہاز میں بکھری بکھری سی کئی خانوں میں بٹ کر بیٹھی رہی۔ دل کہاں تھا تو دماغ کہاں، جسم کہاں تو خیال کہاں۔ میرا دل من پسند نظارہ ہائے شوق کی دید کیلئے مضطرب تھا لیکن آنکھ آس پاس کے مناظر کو بدلنے پر قادر نہیں تھی۔ وقت جہاز کو آگے کی طرف لے کر جا رہا تھا لیکن خوبصورت یادیں مجھے پیچھے کی طرف کھینچ رہی تھیں۔ بار بار چشمِ تصور میں بچوں کے اداس اور غمزدہ چہرے ابھر رہے تھے اور میں دل ہی دل میں اپنے میاں سے شکوہ کر رہی تھی۔

''دیکھو! میں اچھی بھلی خوش باش پاکستان میں رہ رہی تھی اور وہیں رہنا چاہتی تھی لیکن آپ نے رہنے نہ دیا۔ اب مزید کچھ عرصہ یہاں رہنا چاہتی تھی لیکن پھر آپ نے یہاں بھی رہنے نہ دیا۔ واہ میاں جی واہ۔ یہ بھی خوب رہی۔

تیرے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا۔''

میں اپنی سوچوں میں گم تھی کہ جہاز کی رفتار کم ہونے لگی۔ پھر وہ آہستہ آہستہ نیچے اترنا شروع ہوا اور اس نے زمین کو چھو لیا۔ میں بوجھل قدموں سے جہاز سے اتر کر ائرپورٹ کی عمارت میں داخل ہوگئی۔ وہاں اپنا سامان وصول کر کے اسے ٹرالی پر رکھا اور باہر نکل آئی۔ میرے میاں کی نظریں مجھے ڈھونڈ رہی تھیں۔ جونہی ان کی نظر مجھ پر پڑی، ان کی متلاشی آنکھوں میں دیئے سے جل اٹھے اور وہ زیرِ لب مسکرا دیئے۔ ان کو دیکھ کر میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا:

''شکر ہے کہ میری عمرِ عزیز رائیگاں نہیں گئی اور سالہا سال کی ریاضت اور مجاہدے کے بعد بالآخر میں بھی فوج کو اپنے پیچھے لگانے میں کامیاب ہوگئی۔''

☆......☆......☆

سامیہ احسن



# بدلتی دنیا میں عورت کا کردار

۲۲نومبر۲۰۱۴ءکو جماعت اسلامی کے زیر اہتمام خواتین کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ یہ کانفرنس ان کے اجتماعِ عام کا ایک اہم حصہ تھی۔ کانفرنس کا موضوع ’’بدلتی دنیا میں عورت کا کردار‘‘ تھا۔ بعداز نماز ظہر پروگرام کا آغاز ہوا۔ مینار پاکستان کے سائے تلے تقریباً ایک لاکھ خواتین کا منظم مجمع دیکھنے والوں پر ایک عجیب کیفیت طاری کر رہا تھا۔ منہ پر رنگ برنگے جھنڈے بنائے، میک اپ سے سجے چہروں پر دھوپ کے چشمے لگائے، کھلے بال لہراتے ہوئے، فیشن زدہ لباس میں، ملبوس موسیقی کی تال پر رقص کرتی اور بھنگڑے ڈالتی خواتین کے بجائے سر سے پاؤں تک اپنی زینت کو چھپائے، چہروں پر حالات کی سنگینی کا احساس لیے، آنکھوں میں عزم و حوصلے کی چمک کے ساتھ، کندھے سے کندھا ملائے، مضبوطی سے قدم جمائے اس وسیع میدان میں موجود خواتین پاکستان کی اس اکثریت کی نمائندگی کر رہی تھیں جو مغربی تہذیب وتمدن کے بجائے اسلام کی روشنی میں مسائل کا حل ڈھونڈنا اور اپنے لئے لائحہ عمل مرتب کرنا چاہتی ہے۔

پروگرام کی میزبانی کے فرائض محترمہ اسماء ضیا کے سپرد تھے۔ انہوں نے اپنے نپے تلے الفاظ اور برجستہ شعروں کے ساتھ بڑی خوبی سے اس ذمہ داری کو نبھایا۔ پروگرام کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ سمیعہ حنان نے جو کہ قرأت کے مقابلوں میں انعامات حاصل کر چکی ہیں، اپنی پرتاثیر آواز میں تلاوت کی۔ حنا نصر اللہ نے بے حد خوبصورت لحن میں نعتِ رسولِ مقبولؐ سنائی۔ (حنا بھی نعت خوانی کے مقابلوں کی انعام یافتہ ہیں)

تقریب سے افتتاحی کلمات ڈاکٹر سمیحہ راحیل قاضی نے کہے جس میں انہوں نے کانفرنس کے مقصد، ضرورت اور تیاریوں سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے بڑے دلچسپ انداز میں بتایا کہ ہم نے بہت تیاری کی ہوئی تھی لیکن خواتین نے اتنی بڑی تعداد میں آ کر ہمارے سب انتظامات درہم برہم کر دیئے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ’’درہم برہم‘‘ انتظامات بھی دوسروں کے جلسوں کے اعلیٰ انتظامات سے بہت بہتر تھے۔

سمیحہ راحیل قاضی کے بعد محترمہ عائشہ سید نے جو کہ حالیہ اسمبلی میں MNA ہیں، جماعتِ اسلامی کی خواتین کے پارلیمانی کردار پر روشنی ڈالی۔ اس کانفرنس کی ایک خاص بات دوسرے ممالک سے آئی ہوئی خواتین کے وفود کی شرکت تھی۔ ان میں اردن سے صیام ابوالعدس، غزہ سے عفت الجباری، آزاد کشمیر سے شمیم حنیف، انگلینڈ سے یو۔ کے اسلامک مشن کی رابعہ صادق کے علاوہ جرمنی، سعودی عرب، مسقط اور افغانستان سے آئی ہوئی بھی خواتین شامل تھیں۔ محترمہ شمیم حنیف نے جو کہ جماعتِ اسلامی آزاد کشمیر کی قیمہ ہیں، ’’کشمیری خواتین کی فریاد‘‘ سنائی۔ اگرچہ ان حالات سے پہلے ہی سے آگاہی تھی لیکن پھر بھی اپنی مسلمان بہنوں کی تکالیف، مسلم امہ کی بے ضمیری اور اپنی بے بسی کے خیال سے دل گویا نئے سرے سے کڑھنے لگا۔ جامعہ محصنات کی طالبات نے ایسے میں ایک ملی ترانہ سنا کر ماحول میں گرم جوشی پیدا کر دی۔ اس کے بعد مدیرۂ بتول محترمہ صائمہ اسماء نے ’’عورت کی منزل، اسلام یا فیمنزم‘‘ کے موضوع پر خیالات کا اظہار کیا اور بڑے مدلل انداز میں اسلام کی روشن راہوں اور تانیثیت (فیمنزم) کے تاریک راستوں کے مابین فرق واضح کیا۔

صائمہ اسماء کے بعد غزہ سے آنے والی مہمان خاتون محترمہ عفت الجباری نے ’’جنگ زدہ علاقوں کی متاثرہ عورت‘‘ کی تکلیف دہ صورت حال بیان کی۔ اگرچہ وہ عربی زبان میں بول رہی تھیں لیکن ان کا خطیبانہ انداز، جذبے سے بھرپور جوشیلی آواز اور لہجے کا درد ان کے جذبات کو براہِ راست ہمارے دلوں میں منتقل کر رہا تھا۔ اور علامہ اقبالؒ کا یہ مصرعہ بار بار ذہن میں گونج رہا تھا کہ:

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

اس کیلئے الفاظ کی مکمل تفہیم کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔

جماعتِ اسلامی پاکستان کی سیکرٹری جنرل ڈاکٹر رخسانہ جبین نے جماعتِ اسلامی کی خواتین کی کارکردگی اور رفاہی کاموں کے حوالے سے گفتگو کی۔ یہ ان کے عہدے کی مدت کا آخری دن تھا۔ اس کے بعد نو منتخب سیکرٹری جنرل محترمہ دردانہ صدیقی نے اپنے عہدے کا حلف اٹھایا۔ اسی دوران امیر جماعت اسلامی جناب سراج الحق صاحب جلسہ گاہ میں تشریف لے آئے۔ انہوں نے دوران خطاب معاشرے میں خواتین کے مثبت کردار اور ان کے حقوق کے تحفظ کی ضرورت پر زور دیا۔ خواتین کے حوالے سے انہوں نے اپنی جماعت کے سیاسی ایجنڈے کی بھی وضاحت کی۔ ان کی تقریر بہت حوصلہ افزاء اور امید افزا تھی۔

آخر میں ان خواتین کے لیے ایوارڈز کا اعلان کیا جن کی زندگیاں خواتین اسلام کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ پہلا ایوارڈ آپا حمیدہ بیگم کے لیے تھا جو جماعتِ اسلامی پاکستان کی پہلی قیمّہ تھیں اور جن کی خدمتِ دین کی لگن میں دیوانہ وار کاوشوں کے قصے اپنی امی سعیدہ احسن کی زبان سے اتنی دفعہ سنے تھے کہ ان کا نام سنتے ہی ''وقت کم ہے اور مقابلہ سخت'' کا تصور ذہن میں آ جاتا ہے۔ ان کے علاوہ ایوارڈ پانے والی خواتین میں محترمہ شکورہ آفتاب تھیں جنہوں نے اسلامی جمعیت طالبات کا آغاز کیا اور مثلِ آفتاب زندگی گزاری۔ محترمہ ناصرہ الیاس جنہوں نے الخدمت کی بنیاد رکھی، محترمہ سعیدہ وارثی جنہوں نے غزہ کے معاملے میں حکومت کے مناسب رویہ اختیار نہ کرنے پر پارلیمنٹ سے احتجاجاً استعفیٰ دے کر ثابت کر دیا کہ ایک مسلمان کے لیے ذاتی مفاد کے بجائے ملی مفاد مقدم ہوتا ہے اور وہ انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی سوچ کا حامل ہوتا ہے۔ محترمہ بنت الاسلام جنہوں نے تحریر کے ذریعے جہاد کا راستہ اپنایا اور جن کی دینی موضوعات پر تحریریں خصوصاً اسوۂ حسنہ، زندگی بے بندگی شرمندگی اور سلسلہ اخلاقیات کی کتب رشد و ہدایت اور تفہیم دین کے لیے گراں قدر سرمایہ ہیں۔ اس کے علاوہ بچوں اور بڑوں کے لیے بہت سی دلچسپ اور بامقصد ادبی کتب کا ذخیرہ بھی ان کے قلم نے فراہم کیا۔ آپا نثار فاطمہ جنہوں نے پارلیمنٹ میں دین پسند خواتین کی بھرپور اور دبنگ انداز میں نمائندگی کی اور جن کے سامنے غیروں کا چراغ کبھی نہ جل سکا۔ اگرچہ ان خواتین کا ہر عمل اپنے خدا کی خوشنودی کے لیے تھا اور وہ اسی سے صلے کی طلبگار تھیں۔ کسی دنیاوی ایوارڈ کی نہ انہیں تمنا تھی اور نہ ضرورت۔ لیکن جماعت کی طرف سے ان کی خدمات کا اعتراف قابل تحسین بھی ہے اور اس میدان میں نئے آنے والوں کو اپنے ان پیش رووں سے متعارف کروانے اور ان کے دلوں میں ان کی پیروی کرنے کی خواہش پیدا کرنے کا سبب بھی۔

حلقہ اسلامی سے تعلق رکھنے والی ان خواتین کے علاوہ ایک ایوارڈ کنیئرڈ کالج کی سابقہ پرنسپل مسز میرا فیلبوس کے لیے بھی تھا جنہوں نے پاکستان میں خواتین کے لیے تعلیمی شعبے میں اہم خدمات انجام دیں۔

کانفرنس کا اختتام تقریباً سوا چار بجے ہوا۔ اس دوران خواتین ہی نہیں بلکہ ان کے ساتھ آئے ہوئے چھوٹے چھوٹے بچوں میں بھی بے حد نظم وضبط دیکھنے میں آیا۔ جب کسی بھی بھگدڑ کے بغیر ہم ایک بڑے ہجوم کے ہمراہ جلسہ گاہ سے باہر نکل کر سڑک پر پہنچے تو ایک دفعہ پھر بے اختیار دل نے انتظامات کی عمدگی کو سراہا۔

اس شاندار اور کامیاب کانفرنس کو الیکٹرانک میڈیا نے مکمل طور پر نظرانداز کر کے اس کے وجود کو عدم ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ بظاہر ان کے نمائندے وہاں موجود تھے اور کانفرنس کو کور (Cover) بھی کر رہے تھے۔ لیکن ٹی وی پر اجتماع عام کی ایک سرسری سی خبر ہی چلائی گئی اور خواتین کانفرنس کا ذکر تو ایسے گول کر گئے کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ یہ ان کے اپنے دلوں کا کینہ تھا یا امریکہ بہادر اور یورپی طاقتوں کا خوف کہ کہیں وہ اتنی بڑی تعداد میں چہرہ چھپائے، اوڑھے لپیٹے خواتین کو دیکھ کر ہمارے میڈیا کو نااہل قرار نہ دے دیں جو اتنی کاوش کے باوجود ان عورتوں کو ''راہ ہدایت'' پر لانے اور ان ''پابندیوں'' سے جان چھڑانے پر آمادہ نہ کر سکا۔ جماعتِ اسلامی کو الیکٹرانک میڈیا کے بجائے اب سوشل میڈیا پر توجہ کرنی چاہیے۔ بڑھتے ہوئے طوفان کا راستہ کوئی نہیں روک سکتا۔ اس طوفان کو نئی نسل کے دلوں میں منتقل کرنے کیلئے ضروری ہے کہ ان تک اپنا پیغام پہنچایا جائے۔ اور اس کے لیے ایسے ذرائع اختیار کیے جائیں جن سے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکے۔ امید ہے کہ اللہ کی مدد سے انہیں اپنے مقاصد میں کامیابی ہوگی، اور وہ اسی استقامت اور تنظیم کے ساتھ راہ حق کی مسافت طے کرتے رہیں گے۔ ☆

افشاں نوید

# تسبیح روز و شب کا دانہ دانہ

نانی اماں رہتی تو ماموں جان کے ہمراہ تھیں۔ ماموں جان ریلوے میں ملازم تھے کچھ عرصہ بعد ان کا تبادلہ ایک شہر سے دوسرے شہر ہو جاتا۔ جب کبھی کراچی تبادلہ ہو جاتا تو ہمیں بھی نانی اماں کی شفیق صحبت میسر آ جاتی۔ ان کے آنے کی خوشی یوں بھی ہوتی تھی کہ وہ سب کے لئے علیحدہ علیحدہ تحفے لاتی تھیں۔ اور تحفے دینے کے بہانے ڈھونڈا کرتیں۔ مثلاً کوئی نیا کلمہ یاد کر لیا کسی بچے نے، کوئی رکوع حفظ کر لیا۔ کلاس میں نمایاں پوزیشن آ گئی۔ یا کسی کے رویے میں کسی بات سے وہ متاثر ہو گئیں۔ مثلاً کسی نے نماز کیلئے سب کو جگا دیا۔ یا دو بہن بھائیوں کے بیچ صلح کرا دی، یا لپک کر امی کا کام کر دیا۔ وہ ہماری استاد نہیں بلکہ اتالیق تھیں۔ ان کی ہلکی سی رضائی تھی جس کو وہ سر پر اوڑھ کر بیٹھ جاتیں سردیوں کی صبح میں اور ہر صبح قصیدہ بردہ شریف بڑی خوش الحانی سے پڑھا کرتیں جو انہیں زبانی یاد تھا۔ گلستان و بوستان سے انہوں نے ہمیں متعارف کرایا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر حکایات رومی سنا کر ہماری اصلاح کیا کرتیں۔ اکثر مطالعہ میں مصروف رہتیں۔ ان کی اٹیچی میں کپڑے وغیرہ رہتیں۔ وہ کہتیں انہوں نے سات برس کی عمر سے کبھی کوئی نماز قضا نہیں کی۔ جس کی عادت ان کے والدین نے بچپن سے ڈالی تھی۔ تب کے والدین شاید بچوں کے کیریئر لیٹر اور اپ گریڈنگ کے ان سرابوں کے بجائے اپنے بچوں کی حقیقی تربیت ہی پر توجہ ملحوظ رکھتے ہونگے۔

نانی اماں نوافل بڑے اہتمام سے ادا کرتیں اور فرض نمازوں کی طرح گھڑی دیکھ دیکھ کر نوافل کا بھی انتظار کرتیں۔ اشراق، چاشت، اوابین اور تہجد کے نوافل باقاعدگی سے ادا کرتیں، ان کی صحبت میں رہ کر ہم گھر کے بچے بھی نوافل شوق سے پڑھنے لگے۔ ماموں جان کا تبادلہ لاہور ہو گیا نانی اماں پھر بچھڑ گئیں۔ اس روز چاشت کے نوافل پڑھنے کے لیے میں دوپٹہ سلیقہ سے باندھنے لگی تو ابا جان بولے نوافل وغیرہ بڑے بوڑھوں کیلئے ہیں تم فرائض پر توجہ دو۔ پڑھائی میں اور محنت کرو اور گھر کے کاموں میں امی کا ہاتھ بٹاؤ۔ میں نے کہا کہ نانی اماں بتاتی ہیں کہ ان نوافل کا بہت ثواب ہے۔ ابا جان بولے حدیث کے الفاظ ہیں کہ بندہ سب سے زیادہ اللہ کے قریب فرائض کی ادائیگی کے ذریعے ہوتا ہے۔ اگر تم فرائض توجہ سے ادا کر لو تو بہت نفیس۔ نوافل وغیرہ کیلئے عمر پڑی ہے ابھی۔ بس معصوم کچا ذہن۔ ہر بات پتھر کی لکیر کی طرح نقش ہو جاتی ہے۔ نانی اماں نے نوافل کی اہمیت بتائی تو وہ عادت کا حصہ بن آئی ابا جان نے فرائض کی اہمیت کی بات کی تو نفل جاتی رہیں۔ وقت تو بہت محدود ہوتا ہے اور ہر گھڑی اپنی مصروفیت رکھتی ہے۔ عبادات انسان کو خود نہیں بلاتیں انسان خود لپک کر جاتا ہے۔ آپ بے نیازی برتیں تو رب کی تو صفت ہے ہی بے نیازی۔ جو ساری عمر سجدے سے محروم رہتے ہیں زندگی تو ان کی بھی گزر جاتی ہے۔ جو رمضان میں بھی لہو لعب میں مصروف رہتے ہیں عید تو وہ بھی مناتے ہی ہیں۔ نوافل تو کیا عمریں تو فرائض کے بن بھی گزر ہی جاتی ہیں۔

آج جو میز پر ''مجموعہ وظائف'' نامی کتاب دیکھی تو کھول کر پڑھنے لگی۔ تب دل یکبارگی بری طرح دھڑکا اور نانی اماں کی یاد نے اتنا بے کل کر دیا کہ قلم نہ اٹھائی تو ذہن ماؤف ہو جاتا۔ کتاب میں ڈھیروں وظیفے اور دعائیں۔ ہر اک کی الگ الگ فضیلت درج تھی۔ نانی اماں ہم سب کو دعائیں اور وظیفے یاد کراتیں۔ بار بار پڑھنے کی تلقین کرتیں کہ دل سیاہ ہو جاتے ہیں جب یاد الٰہی سے غافل ہو جاتے ہیں۔ وہ با آواز بلند ذکر کرتی رہتیں کچھ نہ کچھ۔ آج جب وظائف کی کتاب میں میں نے پڑھا کہ حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے ہر شخص کے جوڑ جوڑ پر صبح کو صدقہ ہے۔ پس ایک دفعہ سبحان اللہ کہنا بھی صدقہ ہے۔ الحمدللہ کہنا بھی صدقہ ہے۔ لا الہ الا اللہ اور اللہ اکبر کہنا

بھی صدقہ ہے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر بھی صدقہ ہے۔ اور اس لشکر کی ادائیگی کیلئے دو رکعتیں کافی ہیں جو آدمی چاشت کے وقت پڑھے۔ (صحیح مسلم)۔

جامع ترمذی میں مذکور ہے حضرت ابوذر غفاریؓ کی یہ روایت بھی کہ ''اے فرزند آدم تو دن کے ابتدائی حصے میں چار رکعتیں میرے لئے پڑھا کر میں دن کے آخری حصے تک تجھے کفایت کروں گا۔'' خود حضرت عائشہؓ کو یہ رکعتیں اتنی محبوب تھیں کہ فرماتیں ''اگر میرے والدین پھر سے دنیا میں بھیج دیئے جائیں تو ان کی زیارت و ملاقات کی پرمسرت مشغولیت میں بھی ان رکعتوں کو نہیں چھوڑوں گی۔'' صلوٰۃ التسبیح، تہجد، اشراق، اوابین کے نوافل کتنی فضیلت مذکور ہے ان سب کی۔ میں سوچنے لگی کہ ابا جان نے کہا تھا ''تم فرائض کا معیار بہتر بناؤ'' تو سو فرائض کا معیار تو کیا بہتر ہوتا نوافل بھی ہاتھ سے گئے۔ اب اگر اپنے گزرے ہوئے روز وشب کا تخمینہ لگاؤں اگر دو نوافل اشراق، چار چاشت اور چھ اوابین کے پڑھ لیتی تو اک دن کے 12 نوافل۔ دس دن کے 120 ایک ماہ کے 360 نوافل پڑھ ہی لیتی۔ ایک سال کے چار ہزار تین سو بیس نوافل ہو جاتے۔ دس سالوں کے 40 ہزار سے زائد۔ زندگی کے کتنے عشرے گزرتے چلے گئے۔ اللہ کو تعداد سے کیا سروکار۔ اس کو تو ہمارے سجدوں کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ ہماری آہ وزاری بھی اس کے کس کام کی ہے۔ اس کی ضرورت تو خود ہمیں کو ہے۔ اب اگر میں چاہوں کہ اتنی بڑی محرومی کا ازالہ کر دوں تو اتنے روز وشب کہاں سے لاؤں۔ تسبیح روز و شب کا دانہ دانہ میری زندگی سے کم ہوتا رہا۔ قطرے چھلکتے رہے صراحی خالی ہوتی گئی زیست کی۔ کتنی پیاری عادت ڈلوائی تھی نانی اماں نے۔ وہ عادت قائم رہتی تو ہر دن میں کتنی نیکیاں اکٹھی ہوتی جاتیں۔ ان سجدوں سے محرومی بھی کتنی بڑی محرومی ہے۔ کسی نیکی کی توفیق ملنا بجائے خود نیکی ہے سعادت ہے۔ اور کسی نیکی کی سعادت چھن جانا بجائے خود کسی بڑی شقاوت ہے۔

نانی اماں آپ نے کوئی فرض نماز قضا نہیں کی۔ نوافل کی کتنی کثرت آپ کے اعمال نامے کو کتنا اکرام بخشا ہوگا۔ آپ تو قصیدہ بردہ شریف بھی آنسوؤں کے ساتھ رِقت سے پڑھتی تھیں۔ ہم گزرے روز و شب کہاں سے لائیں۔ جو باقی ہے عمر اس میں تو گناہوں کا کفارہ بھی مشکل ہے۔ کاش وہ اک اک دن یوں بند مٹھی کی ریت کی طرح نہ پھسل گیا ہوتا۔ لاکھوں نیکیوں سے محرومی۔ دنیا کے تقاضے تو پورے ہوتے ہی رہے۔ زندگی سعادتوں سے محروم رہ گئی۔ اور دکھ تو یہ کہ احساسِ زیاں بھی ہوا تو عمر کے کس حصے میں! یکدم میری نظر اپنے بیٹے پر پڑی جس کے سرہانے الارم بج رہا تھا جو غالبًا اس کو جگانے کے بجائے اس کے لیے لوری کا کام کر رہا تھا۔ میں نے مایوسی کو اپنے بائیں جانب دھکیل دیا اور ایک عزم سے اپنے بیٹے کو جگایا۔ جو کچھ میں کھو چکی ہوں وہ سب اس کو پانا ہے۔ اس کے بھی جوڑ جوڑ پر صدقہ واجب ہے جو محض دو رکعت سے ادا ہو سکتا ہے۔ یہ میری طرح روز وشب کا حساب کر کے یوں دل گرفتہ نہ ہو۔ اس سے نیکیوں کے لمحات یوں ضائع نہ ہوں۔ یہ میری طرح جمع ضرب کر کے یوں آہیں نہ بھرے۔ ہر دن بہت قیمتی ہے اہل ایمان کی زندگی کا اور مومن کی تو ہر لحظہ نئی شان ہوتی ہے۔

میں نے اس کی پیشانی پر بوسہ دے کر اس کا ہاتھ تھام کر اس کو بستر سے اٹھایا۔ رات کی سیاہی رخصت ہو رہی تھی سچ مچ اک نئی صبح اتری تھی میرے آنگن میں۔

☆......☆......☆

# یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کیلئے

پڑھائی کے سلسلے میں انگلینڈ آتے ہوئے میں نے صائمہ اسماء صاحبہ کو ایک ایس ایم ایس کر کے انفارم کیا کہ اب میرے لئے بتول میں لکھنا کچھ عرصے کے لئے مشکل ہوگا۔ مگر جواب ملا کہ اپنے تجربات، حالات اور واقعات لکھ کر بھیج دینا۔ سو وہی حاضر خدمت ہے۔

انگلینڈ آتے ہی میری ساری توجہ اس بات پر تھی کہ یونیورسٹی آنے جانے کا راستہ جلد از جلد سیکھ لوں تا کہ کلاسز شروع کرتے ہی اکیلے آجا سکوں۔ لہٰذا روزانہ اپنی بہن کے ساتھ بس کا سفر کرنے کے لیے گھر سے نکل جاتی تھی کیونکہ بس سسٹم انگلینڈ میں کافی اچھا اور سستا (اسٹوڈنٹ ڈسکاؤنٹ) ہے۔ اس لیے شروع شروع میں کافی مزہ آتا رہا اور گھر سے دو بسیں بدل کر جانا اچھا لگتا رہا۔ ستمبر کے آغاز ہی میں یہاں کافی سردی محسوس ہوئی لیکن اوور آل موسم خوشگوار تھا۔ بہر حال جلد ہی میں بس سسٹم سے آشنا ہوگئی اور انٹروڈکشن ویک کے شروع ہوتے ہی میں نے آنا جانا شروع کر دیا۔ میرے لئے اس ویک میں جانا ضروری نہ تھا لیکن میں اپنی عادت ڈالنے کی غرض سے جاتی رہی اور مزے لیتی رہی۔ بہر حال اس ویک کے فوراً بعد ہی کلاسز کا سلسلہ شروع ہوا اور پہلی کلاس کے دن ہی صبح سویرے ہی سے بارش اور سردی کا آغاز ہوگیا۔ دراصل سردی میں کہیں آنے جانے کا تصور ہی میرے لئے بڑا پریشان کن تھا۔ لیکن مرتی کیا نہ کرتی کے مترادف جانا ہی پڑا۔ اگلے دن بھی موسم ایسا ہی رہا۔ تیسرے دن میری کلاس نہ تھی اس لئے جانا ضروری نہ تھا لہٰذا میں نے رات ہی کو سوچ لیا کہ میں ایسے خراب موسم میں نہ جاؤں گی۔ صبح اٹھی تو دیکھا کہ موسم بہت اچھا ہے اور تھوڑی ہی دیر بعد سورج پوری آب و تاب سے نکل آیا۔ اسی طرح پورا ہفتہ سورج کی خوبصورت روشنی اور ہلکی پھلکی سردی میں گزر گیا۔ میں خوش تھی مگر یہ کیا منگل (میری کلاسز صرف منگل اور بدھ ہی کو ہوتی ہیں) آتے ہی بارش اور سردی شروع ہوگئی اور میں پریشان حال کلاس میں جاتی رہی لیکن جیسے ہی کلاس کے دن ختم ہوئے سورج پھر اپنی آب و تاب دکھانا شروع ہو گیا۔ اس طرح 3 ہفتے گزر گئے۔ چوتھے ویک میں تو حد ہی ہوگئی مجھے منگل کو صبح جلدی جانا تھا اور موسم انتہائی خراب ہوگیا۔ دل چاہا کہ نہ جاؤں مگر جانا لازمی تھا۔

سونے پر سہاگہ اسی دن اچانک مجھے ایک کیمپس سے دوسرے کیمپس جانے کی ضرورت ہوئی موسم ٹھنڈا ہونے کے ساتھ ساتھ بارش بھی شروع تھی۔ دل کڑا کر کے جو باہر نکلی تو تھوڑی ہی دور جانے کے بعد اولے پڑنے شروع ہوئے اور ایسے زوردار طریقے سے پڑے کہ میرے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ میں نے بھاگ کر قریبی بلڈنگ میں پناہ لی۔ میں گھر جانے کی فکر میں تھی لیکن ابھی اگلی کلاس اٹینڈ کرنا باقی تھا۔ خدا خدا کر کے وقت گزرا اور بارش تھمی۔ گھر واپس آتے ہوئے خوش تھی کہ اگلے دن کلاس نہ تھی اور میں گھر ہی میں اپنا کام کر سکتی تھی۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوا کہ اب سردی شروع ہوگئی ہے۔ لیکن صبح اٹھی تو حیران رہ گئی سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ تمام دن چمکتا رہا۔ یکا یک مجھے علامہ اقبال کا یہ شعر یاد آیا۔

تندیِ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کیلئے

اور یقین کریں کہ اس شعر کا مفہوم بھی پہلی مرتبہ ہی سمجھ آیا۔ واقعی جب ہوائیں تیز چلتی ہیں اور بادل برسنے کو بے تاب ہوتے ہیں تو جہاں تمام پرندے اپنے محفوظ ٹھکانوں کی طرف رخ کرتے ہیں وہیں عقاب بادلوں سے اوپر کی طرف اڑتا ہے تا کہ بارش اور تند ہوائیں اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔ اس شعر کے ذہن میں آتے ہی جیسے میں مطمئن ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں قرآن کی سورہ الم نشرح کی آیات آ گئیں

جن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ''پس تنگی کے ساتھ آسانی ہے۔ بے شک تنگی کے ساتھ آسانی ہے''۔ مولانا وحیدالدین کتاب زندگی صفحہ ۲۵ میں لکھتے ہیں کہ گنے کا رس نکالنے کے لیے جب اسے ایک روائتی قسم کے کولھو میں ڈالا جاتا ہے تو اس پر کم دباؤ پڑتا ہے اور کم رس نکلتا ہے لیکن جب گنے کو بجلی سے چلنے والے کرشر میں ڈالا جاتا ہے تو اسے چار مرتبہ مشینی بیلن کے درمیان سے گزارا جاتا ہے اس طرح اس پر زیادہ دباؤ ڈالا جاتا ہے اور گنے کا تمام رس نکالا جاتا ہے۔ اس مثال سے وہ اللہ کا یہ قانون سمجھاتے ہیں کہ انسان کے اندر چھپے امکانات اسی وقت ظاہر ہوتے ہیں جب وہ دباؤ کا شکار ہو' جب اس کی شخصیت کو نچوڑنے والے عمل سے گزارا جائے۔'' اور یہ کہ تاریخ میں بڑی ترقی پانے والے وہی لوگ تھے جنہوں نے انّ مع العسر یسرا کے حقیقی راز کو پایا۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ ''انسانی نگاہ مشکل کو مشکل کے روپ میں دیکھتی ہے جب کہ ربانی نگاہ وہ ہے جو مشکل کو آسانی کے روپ میں دیکھنے لگے''۔ (ص:۲۵) بس اس مضمون کو پڑھ کر قرآن سے حکمت کی جو بات میری سمجھ میں آئی وہ یہی تھی کہ مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔

☆......☆......☆

# سعادت کی زندگی، شہادت کی موت

# پروفیسر غلام اعظمؒ

## ڈھاکہ میں آخری پاکستانی مجاہد

حافظ عبدالوحید فتح محمد

ہم نے زندگی میں پہلی دفعہ یہ حیرت انگیز واقعہ اپنے گھر میں دیکھا کہ گھر میں ہزاروں میل سے آئے ہوئے ایک عجب سے لہجے میں اُردو زبان میں گفتگو کرنے والے معزز مہمان کے لئے اُبلے ہوئے چاول اور شوربہ والی مچھلی پکائی گئی اور مہمان گرامی نے روٹی کا نوالہ تک نہ لیا اس دن مردان خانہ بیٹھک میں روٹیوں والی چنگیر بھی نہ چُنی گئی۔ یہ مہمان تھے پروفیسر غلام اعظم صاحبؒ۔ گھر راولپنڈی تھا۔ ہم پروفیسر صاحب اور قبلہ مولانا فتح محمد (والد صاحب) کے ہمسفر ہو لئے۔ بس میں بیٹھ کر راولپنڈی سے تقریباً 30 میل ملکہ کوہسار کوہ مری پہلی دفعہ جانے کا اتفاق عظیم مجاہد پروفیسر غلام اعظم کی ہمراہی میں ہوا۔ علامہ اقبال کے اس شعر جو کہ فارسی زبان میں ہے سننے کا اتفاق پہلی دفعہ موصوف سے ہوا تشریح بھی انہی کی۔

ہر کہ رمزِ مصطفیٰ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است

جس نے سید الانبیاء کی رمز کو پہچان لیا۔ اُسے کسی چیز کا خوف بھی شرک لگتا ہے۔ اُسی پہلی نشست میں جو مری میں تھی وہابی اور امام التوحید محمد بن عبدالوہابؒ کا نام بھی سُنا، بات ہو رہی تھی شرک و بدعت کی قبلہ والد صاحب نے کہا کہ ہمیں یہاں مغربی پاکستان میں تو وہابی اور امریکی ایجنٹ کہا جاتا ہے، مشرقی پاکستان کا کیا حال ہے تو موصوف نے فرمایا! ''کہ ہمیں بھی وہابی کہا جاتا ہے لیکن اس سے پہلے یہ اضافہ کیا جاتا ہے چونکہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ وہابی ہے غلام اعظم مودودی کا ایجنٹ لہٰذا یہ سارے وہابی ہیں اور امریکی ہیں۔'' یاد رہے پاکستان کے دکاندار قسم کے فرقہ پرستوں نے محترم مرشد مودودیؒ کو وہابی اور امریکی ایجنٹ کہنے میں سیکولر، سوشلسٹ، کمیونسٹ، اور اشترا کیوں کا بانگ دُہل ساتھ دیا۔ غلام اعظم نے اپنی مرضی سے جماعت اسلامی بنگلہ کی مرکزی قیادت کو خود خیرآباد کہا جس کی مثال کم ہی ملتی ہے ورنہ پاکستان میں اور ہندوستان اور بنگلہ دیش میں باپ کے بعد بیٹا وراثتی معاملہ چلتا ہے مذہبی اور سیاسی جماعتوں میں لے دیکر فقط واحد شرف جماعت اسلامی پاکستان اور بنگلہ دیش کو حاصل ہے کہ اُن کے با قاعدہ انتخاب ہوتے ہیں، کبھی اورنگ آباد کا سید مودودی کبھی مشرقی پنجاب کے جالندھر کا میاں طفیل محمدؒ اور کبھی پشاور کا پٹھان قاضی حسین احمدؒ اور کبھی دہلی معلّیٰ کی مسجع ومقفّیٰ زبان والا سید منور حسن، اور اس کے بعد حال ہی میں ٹھیٹھ پشتو بولنے والا سراج الحق منتخب ہوتا ہے۔ اس طرح بنگلہ دیش میں بھی اسلامی شورائیت اور تقویٰ کی بنیاد پر جماعت کی قیادت منتخب ہوتی ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی طرح پروفیسر غلام اعظم کا جنازہ بھی جیل سے اُٹھایا گیا، غلام اعظم، پاکستان کا ایک مجاہد، اپنی قوم سے ناطہ نہیں توڑا اپنے وطن گئے اور پورے سات سال کی عدالتی لڑائی کے بعد وہاں کی شہریت حاصل کر کے اپنی جدوجہد میں مصروف ہو گئے، بنگلہ دیش کا وفادار پاکستان سے مخلص جس نے اپنا کل ہمارے آج پر قربان کر دیا، جس نے پاکستانی ہونے کے ناطے پاکستانی فوج کا دست و بازو بنتے ہوئے سابقہ مشرقی پاکستان میں البدر اور الشمس نامی رضا کار تنظیمیں منظم کر کے پاکستان کی عظیم افواج کا پشتیبان بنا کھڑا کیا۔ کروڑوں پاکستانیوں کی طرح ان کا وطن بھی پاکستان تھا اور حب الوطنی کا تقاضا تھا کہ وہ اس کے ساتھ اپنی وفاداری کو آنچ نہ آنے دیتے۔ مشرقی پاکستان میں انہوں نے اپنے مخلص ساتھیوں کے ہمراہ یہ کردار پوری استقامت سے نبھایا وہ اس پر نہ شرمسار تھے اور نہ کسی احساس جرم میں مبتلا تھے۔ البتہ جب مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا تو وہ بھی اس کے وفادار شہری بن گئے اور اس کی تعمیر و ترقی میں اس طرح دلجمعی سے دلچسپی لینے لگ گئے جس طرح مشرقی پاکستان کی فلاح و بہبود میں حصہ لیتے تھے۔

مفادات اور اغراض کی خاطر جینے والے ہجوم در ہجوم انسانوں کے جنگل میں کوئی دوسرا غلام اعظم کہاں تلاش کریں، موصوفؒ نے پاکستانی فوج کا بھرپور ساتھ آخر دم تک دیا، انہیں 90 سال کی عمر میں 1971ء کے جنگی جرائم، پاکستانی فوج کا ساتھ دینے کے سب سے بڑے جُرم کے الزام میں پہلے سزائے موت اور بعد میں بدل کر 90 سال عمر قید میں بدل دی گئی۔

پاکستانی مسلح افواج کے سابق سالار جناب جنرل اسلم بیگ نے کتنی بڑی صداقت بیان کی ہے۔ ''غلام اعظم کو پاکستان سے محبت کی سزا دی گئی تھی۔'' وہ کہتے ہیں ''میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے غلام اعظم اور ان کے ساتھیوں نے پاکستانی فوج سے مل کر کتنی قربانیاں دی ہیں۔ میں مارچ سے ستمبر 1971ء تک خود وہاں موجود تھا اور بہت سے واقعات کا چشم دید گواہ ہوں۔'' یہ ہے گھر کی گواہی۔ مزید یہ کہ ''پاکستان اور پاکستانی فوج کے خلاف کہانیاں گھڑ کر وہاں کے نصاب میں شامل کر دیں تا کہ پاکستانی فوج کے خلاف زہر پھیلتا رہے۔'' پاکستانی فوج کے ایک جرنیل اور آئی ایس آئی کے سابق سربراہ حمید گل نے کہا ''یہ ملت اسلامیہ کا نقصان ہے، مرحوم متحدہ پاکستان کے آخری سپاہی تھے، جنہوں نے پاکستان کے لئے جنگ لڑی اور قید میں وفات پا کر عزیمت کی ایک نئی تاریخ رقم کر دی۔'' ڈھاکہ جہاں پاکستان کو وجود میں لانے والی مسلم لیگ کا قیام 1906ء میں عمل میں آیا تھا، آخری پاکستانی مجاہد کا جنازہ ہزاروں نہیں لاکھوں نے ادا کیا۔ اللہ تعالیٰ محترم پروفیسر صاحب کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے (آمین)

☆......☆......☆

## پوتے کا خراجِ تحسین

ابو عائشہ، ترجمہ: زہرا نہالہ

25 اکتوبر 2014ء بمطابق یکم محرم الحرام 1436 ہجری کی اداس سہ پہر کو ڈھاکہ کی گلیاں لاتعداد انسانی نفوس سے بھری ہوئی تھیں۔ یہ مغموم لوگ عالم اسلام کے ایک عظیم سپوت پروفیسر غلام اعظم مرحوم کے سفر آخرت میں ان کو آخری منزل تک پہنچانے آئے تھے۔ اللہ رب العالمین اور اس کے سچے دین اسلام کی محبت سے سرشار یہ بندہ نوے سال کی عمر میں قید و بند کی صعوبتیں اٹھاتا داعی اجل کو لبیک کہہ گیا۔ میں ان کے خاندان کا فرد ہونے کے ناطے ان کی پاکیزہ زندگی کے چند پہلوؤں کے بارے میں آپ کو کچھ بتانا چاہوں گا۔ گو آج میں بیرون ملک مقیم ہوں لیکن یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں نے اپنے بچپن اور نوجوانی کے ایام ان کی محبت آمیز صحبت میں گزارے۔

**حالاتِ زندگی:**

میرے دادا پروفیسر غلام اعظم 1922ء میں علماء کے گھرانے میں پیدا ہوئے۔ یہ خاندان پشت ہا پشت سے دینی علوم کے حصول کے حوالے سے خاص مقام رکھتا تھا۔ میرے پردادا نے جو اپنے وقت میں ڈھاکہ کے قاضی تھے۔ جدید رجحانات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس بات کا فیصلہ کیا کہ دینی و شرعی علوم کی تحصیل کیساتھ ساتھ غلام اعظم صاحب کو یونیورسٹی کی تعلیم بھی دلائی جائے تاکہ وہ معاشرے میں ایک موثر کردار ادا کر سکیں۔ میرے دادا بتایا کرتے تھے کہ جب وہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں عربی کی ڈگری لینے کے لیے پہنچے تو وہاں پڑھایا جانے والا تمام نصاب پہلے ہی سے ان کا پڑھا ہوا تھا۔ یونیورسٹی کے دور میں وہ بہت متحرک رہے۔ اس وقت موجودہ بنگلہ دیش مشرقی پاکستان کہلاتا تھا۔ بنگالی زبان کی کو مشرقی پاکستان کی سرکاری زبان کا درجہ دلوانے والی تحریک میں میرے دادا غلام اعظم صاحب پیش پیش رہے۔ ابتداء میں آپ کا تعلق تبلیغی جماعت سے رہا۔ بعد ازاں آپ سیاسی طور پر زیادہ متحرک جماعت یعنی جماعت اسلامی سے منسلک ہو گئے۔ تاہم تبلیغی جماعت سے وابستگی کے دوران حاصل ہونیوالی روحانی برکات زادِ راہ کے طور پر تمام عمر آپ کیساتھ رہیں۔

**کردار:**

میرے دادا کے کردار کی سب سے نمایاں خوبی ان کی نرم مزاجی، نرم گفتاری اور لبوں پر ہر دم رہنے والی مسکراہٹ تھی۔ ان کو بچوں سے خصوصی شغف تھا۔ وہ اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود بچوں سے باتیں کرنے اور کھیلنے کا موقع نکال لیتے۔ وہ کہا کرتے کہ ''بچے تو گھر کی روشنی ہیں۔''

اپنے دادا کے حوالے سے میرے نہاں خانہ دل میں بچپن کی بہت سی خوشگوار یادیں بکھری پڑی ہیں۔ کیسے ہم ان کے ساتھ بلا تکان کھیلتے اور جب کھیل کھیل کر تھک جاتے تو انہی کے بازو پر سر رکھ کر آرام کرتے۔ اس پیار محبت کے ساتھ ساتھ انہیں ہماری دینی تربیت کی بھی فکر رہتی۔ مجھے نماز پڑھنا انہی نے سکھایا۔ رمضان المبارک کے مہینے میں مسجد میں اپنے بچوں اور بچوں کے بچوں کی خصوصی کلاس رکھواتے۔ اعتکاف میں بیٹھنے کے باوجود کلاس میں تعطل نہ آنے دیتے۔ وہ بنگلہ دیش کی سب سے بڑی اسلامی تحریک کے سربراہ تھے۔ دعوت و تبلیغ میں سرگرم ہونے کے باوجود وہ اپنے گھر اور گھر والوں کو نظر انداز نہ ہونے دیتے ان کے اوقات میں برکت اور سب کو وقت دینے کا راز ان کی حد درجہ مضبوط زندگی میں مضمر تھا۔ کم خوراکی اور ورزش ان کی زندگی کا لازمی حصہ تھے۔ نماز انہوں نے ہمیشہ باجماعت ادا کی۔ یہاں تک کہ بڑھاپے میں ایک شخص بطور خاص اس بات کے لیے ملازم رکھا کہ وہ

انہیں بروقت مسجد لے جاسکے۔ وہ اپنی زندگی میں اوقات کار کی خصوصی پابندی کرتے تھے۔ عشاء کی نماز سے فارغ ہوکر جلد سونا اور تہجد کے لئے اٹھنا تمام عمران کی زندگی کے معمولات میں شامل رہا۔ میں نے ہوش سنبھالا تو دادا اور دادی دونوں کو باقاعدگی سے تہجد ادا کرتے دیکھا۔

**حالیہ سیاسی ناطقہ بندی**

میرے دادا کی زندگی کے آخری سال آزمائشوں کا پیامبر بن کر آئے۔ اقتدار کی مسند پر قابض رہنے کے لیے عوامی لیگ کی حکومت نے خاص طور پر حزب اختلاف کی جماعتوں کو نشانہ بنایا۔ اکیسویں صدی کے اوائل میں ہونے والے بنگلہ دیشی انتخابات میں جماعت اسلامی کا حکومت بنوانے میں اہم کردار دراصل جماعت اسلامی سے دشمنی کا باعث بنا۔ عوامی لیگ نے جماعت اسلامی کے رسوخ کو ختم کرنے کے لیے چالیس سال پرانی تاریخ کو ادھیڑنا شروع کیا۔ 1971ء میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کو جذباتی و عصبیتی رنگ دے کر بنگلہ دیشی نوجوانوں میں (جو 1971ء میں پیدا بھی نہ ہوئے تھے) جماعت اسلامی کے خلاف ایک جذباتی مخالفت کی فضا پیدا کردی۔ جماعت اسلامی کے سرکردہ رہنماؤں (جن میں میرے دادا غلام اعظم بھی شامل تھے) کا سب سے بُرا قصور یہ ٹھہرا کہ انہوں نے تقسیم مشرقی پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ آج ان پر غداری کا مقدمہ چلانے والے یہ بات بھول گئے کہ میرے دادا نے کبھی "جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق" کہنے سے پہلو تہی نہ کی۔ جب مغربی پاکستان کی ناجائز و غاصب حکومت کے عہدیداروں نے ان سے اس وقت ملنے کی کوششیں کی تھیں تو میرے دادا نے جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے نہ صرف ان سے ملنے سے انکار کیا تھا بلکہ ان کی بے رحمانہ وغیر منصفانہ پالیسیوں پر کھل کر اظہار خیال کیا تھا اور ان کی مذمت کی تھی۔ ان سب باتوں کو بھلا کر صرف ان کے نظریاتی موقف کہ مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے علیحدہ نہیں ہونا چاہیے کو بنیاد بنا کر پہلے ان کے خلاف عوامی فضا بنائی گئی اور بعد ازاں جنگی جرائم کو بنیاد بناتے ہوئے انتہائی جانبدار عدالت میں ان پر غداری کا مقدمہ چلا دیا گیا۔
یہ تمام عدالتی کاروائی اور اس کی شفافیت پوری دنیا کے لیے سوالیہ نشان ہے۔

ایمنسٹی انٹرنیشنل، ہیومن رائٹس واچ، بار ہیومن رائٹس کمیٹی آف انگلینڈ اور ویلز اور ان جیسی لاتعداد تنظیموں نے اس تمام صورتحال اور کارروائی پر سخت نکتہ چینی کی ہے اور عدم اطمینان کا اظہار کیا ہے۔ مگر افسوس اس سب کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ عالمی سطح پر اس صورتحال کا کوئی خاص نوٹس نہ لیا گیا عالمی رائے عامہ بنانے میں معاون بنگلہ دیشی میڈیا مذہب سے سخت دشمنی رکھتا ہے۔
اس سے پہلے کہ اپیل کے نتیجے میں دنیا کے سامنے اس عدالتی ڈرامے کی بے حقیقی واضح کی جاتی میرے دادا اسیری کی حالت میں ہی اپنے رب سے ملاقات کیلئے چل دیئے۔ انا للہ و انا اِلَیْہِ راجعون۔

**شہادت**

ہم مسلمانوں کو نبی کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ کہ مسلمان باہم جسد واحد کی طرح ہیں۔ جسم کے ایک حصے میں ہونے والی تکلیف کو باقی سارا جسم بھی محسوس کرتا ہے۔
اسی طرح بنگلہ دیش میں حالت اسیری میں وفات پانے والے پروفیسر غلام اعظم مرحوم کی موت اور ان کے ساتھ روا رکھے جانیوالے بے رحمانہ سلوک پر پوری امت کو مضطرب ہونا چاہیے۔ یہ ہمارے عالم اور رہنما کا ہم پر حق ہے۔

ہم نے اپنے دادا کے انتقال کی خبر بڑے غم سے سنی۔ کئی ہفتے سے ان کی حالت تشویش ناک تھی۔ مگر نہ بنگلہ دیشی حکومت نے ان کی پیرانہ سالی کا لحاظ کیا نہ ان کی شدید گرتی ہوئی جسمانی حالت کا اور جمعرات کی رات 10 بج کر 10 منٹ پر چند اہل خانہ کی موجودگی میں انہوں نے جان جان آفریں کے سپرد کردی۔ جنوری 2012ء میں اپنی گرفتاری سے پہلے انہوں نے شہادت کی موت کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی خواہش کو قبول کر لیا۔
میرے دادا کی کئی تالیفات ہیں۔ ان کی کتابیں زیادہ تر بنگلہ زبان میں ہیں۔ ان کتابوں کا مقصد عامتہ الناس میں دین کا صحیح شعور پیدا کرنا اور دینی حوالے سے روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے مسائل کا حل بتایا گیا ہے۔

میرے دادا جاتے جاتے بنگلہ دیش کے مسلمانوں کو خصوصاً اور تمام دنیا کے مسلمانوں کو عموماً یہ پیغام دے کر گئے کہ فرد کی زندگی میں سب سے اہم ترین چیز اس کا اپنے رب سے تعلق ہے۔ رب سے تعلق ہی کا تقاضا ہے کہ ہم ایسے معاشرے کے قیام کے لیے کوششیں کریں جہاں اللہ کا حکم سب سے اونچا ہو۔

اللہ رب العزت میرے دادا کی شہادت کو قبول فرمائے ان کی بشری کمزوریوں کو بخش دے اور ان کو جنت میں بغیر حساب کے داخل کر دے۔ آمین۔ (بشکریہ: مسلم میٹرز آرگنائزیشن) ☆

# آہ! صغیرہ بانو شیریں

سمجھ نہیں آتی کہ اپنی اور صغیرہ کی دوستی کا ذکر کہاں سے شروع کروں۔ ہمارا تعلق ایک طویل عرصے پر محیط ہے۔ کم و بیش 25 سال! صاف گو، ہمدرد، سخن نواز، شیریں سخن، مستعد سوشل ورکر اور دوسرے کے درد یا تکلیف پر فوراً مدد کرنے یا جو بھی ان کے بس میں ہو کرنے کیلئے مستعد اور تیار دکھائی دیتیں۔ اُردو ڈائجسٹ سے انہوں نے چالیس سال کی رفاقت نبھائی افسانے، انٹرویو، کہانیوں سے بڑھ کر ان کا سوال و جواب کا سلسلہ یا ٹوٹکے مشہور ہوئے۔

دُور دُور سے ہر مسئلے کیلئے خط اُن کے پاس آتے۔ جب بھی ملاقات ہوتی یا فون آتا تو سب سے دلچسپ خط مجھے ضرور سناتیں۔

سمن آباد والے گھر میں ایک کمرہ ان کی لائبریری تھا۔ وہاں ہی میز کرسی ڈال رکھی تھی۔ وہاں بیٹھ کر لکھتی تھیں۔ اس کا ایک دروازہ باہر برآمدے کی طرف کھلتا تھا۔ لہٰذا جو بھی ملاقاتی ہوتے وہ اسی درواز سے اندر تشریف لاتے وہاں ہی چائے آجاتی تواضع اور کام کے بعد وہاں سے ہی واپسی ہو جاتی۔ ایک دفعہ انہوں نے مجھے بتایا۔ کہ دو لڑکیاں سیاہ برقعوں میں ملبوس اندر آئیں۔ ان کی صرف آنکھیں نظر آتی تھیں چہرے ڈھانپے ہوئے تھے عجیب سی آنکھیں تھیں گول گول اور چمکدار۔ میں نے پوچھا ''کیا کام ہے؟'' کہنے لگیں ''یہ کچھ پیسے ہیں آپ کو دینے تھے۔'' انہوں نے ایک لفافہ مجھے پکڑایا ابھی میں نے انہیں کہنا تھا کہ بیٹھیں کہ وہ جانے کیلئے واپس پلٹ گئیں۔ برآمدے اور بیرونی گیٹ میں چار یا چھ قدم کا فاصلہ ہے میں نے لفافہ کھولا تو وہ کئی نوٹ تھے۔ مجھے لگا کہ غلطی سے نہ دے گئی ہوں۔ پیچھے گئی۔ گیٹ کھولا دور تک دائیں بائیں سامنے ہر طرف دیکھا ٹریفک بھی نہیں تھی لیکن وہ یکدم کہاں غائب ہو گئیں۔ گاڑی بھی نہیں تھی اتنی دیر میں گاڑی سٹارٹ ہوتی تو پتہ چلتا۔

میں نے پوچھا ''آخر وہ کون ہو سکتی ہیں؟'' جواب دیا۔ شاید جنوں میں سے تھیں۔ وہ انسان نہیں لگتی تھیں مجھے شک ہوا لیکن تصدیق سے پہلے ہی وہ غائب ہو گئیں۔

وہ اکثر لوگوں کے لیبارٹری ٹیسٹ، ادویات، شادیوں یا کسی کا قرضہ اتارنے کیلئے رقم فراہم کرتی تھیں جب میں نے پوچھا کہ آخر یہ رقم کہاں سے آتی ہے تو اس کے جواب میں انہوں نے یہ واقعہ سنایا کہ بس اس طرح اللہ میاں بھجوا دیتا ہے میں خرچ کرتی رہتی ہوں۔

ان کے شوہر آفاق صاحب ایک مشہور وکیل تھے لیکن بیماری کے سبب انہوں نے جلد ہی پریکٹس کم کر دی بعد میں جب گردے بالکل بیکار ہو گئے۔ تو عدالت جانا چھوڑ دیا۔ بے حد شوہر پرست تھیں۔ ان کا خیال، خدمت، دوائی، خوراک، ایکسرے، ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا، یہ سب ان کے فرائض میں شامل تھا بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔

وفات کے وقت وہ اپنی بڑی بیٹی کے گھر تھیں۔ داماد، بیٹی اور نواسوں نے ان کی بہت خدمت کی اور خیال رکھا۔ غالباً ان کا انتقال اکتوبر کے پہلے ہفتے میں ہوا اور تقریباً گیارہ دن بعد یہ اطلاع بذریعہ فون میری بیٹی کو سیالکوٹ ملی اور تین دن بعد اس نے فون پر مجھے بتایا انا للہ وانا الیہ راجعون ہ میں فون ٹرائی کرتی رہی لیکن اُن کا موبائل بند ملا خدیجہ سے بات نہ ہو سکی۔

ان کے بیٹے احمد بہو اور پوتی فیصل آباد آ کر رہے تو ان دنوں میں خوب ملاقاتیں رہیں۔

انہیں ولیوں، بزرگوں، صوفیوں اور اہلِ تقویٰ کی ہمیشہ تلاش رہتی اور کسی نہ کسی طرح ان کو ڈھونڈ نکالتیں اور ان سے فیض حاصل کرتیں۔ فیصل آباد کے قریب ایک قصبہ ہے دسوہا وہاں سلام کیلئے جایا کرتی تھیں۔ وہاں صوفی برکت تھے۔

ہم اُن دنوں میڈیکل کے پیشے کی بدولت، مریض، آپریشن،

آؤٹ ڈور اور ان ڈور کے چکروں میں پڑے ہوئے تھے۔ دسوہا میں مسٹر مصدق جن کے نانا صادق صاحب وزیر رہ چکے تھے۔ دسوہا اُن کا علاقہ تھا وہاں سے وہ منتخب ہوا کرتے تھے۔ انہوں نے وہاں بلکہ ان کی والدہ سروری صادق صاحبہ نے ایک ہسپتال صادق ہسپتال کے نام سے بنوایا۔ اس کے سلسلے میں مشورے کیلئے وہ میرے پاس تشریف لائے۔ ہسپتال مکمل ہوگیا۔ وہ گائنی کا ہسپتال تھا جس میں 8 بیڈ اور دو پرائیویٹ کمرے عملے کیلئے رہائش، ایمبولینس، آپریشن تھیٹر، لیبر روم، ڈسپنسری، آؤٹ ڈور موجود تھا۔ میں اپنے سٹاف کے ساتھ ہفتے میں ایک دن جایا کرتی۔ پہلی میڈیکل ڈاکٹر فہمیدہ الیاس صاحبہ مقرر ہوئیں (جواب غلام محمد آباد میں پریکٹس کرتی ہیں) ماشاءاللہ اپنے مریضوں اور علاقے میں بہت مصروف، نیک نام اور مشہور ہیں۔ ان کی نیک دلی، رحمدلی اور خدا ترسی کے واقعات سن کر خوشی ہوتی ہے کہ ہم نے کچھ عرصہ نیشنل ہسپتال میں ایک ساتھ گزارا تھا۔ اب سوچتی ہوں ایسی چنگاری بھی یا رب اپنی خاکستر میں تھی۔ یوں تو وہاں ڈاکٹر ناصرہ، ڈاکٹر سکینہ بنت علی، ڈاکٹر شائستہ، ڈاکٹر قیصرہ، ڈاکٹر شمائلہ، ڈاکٹر نجمہ، ڈاکٹر عفت، ڈاکٹر شگفتہ خالد، ڈاکٹر نوشابہ ابرار، ڈاکٹر نسیم، ڈاکٹر نسرین، ڈاکٹر نزہت، ڈاکٹر روبیہ، ڈاکٹر تسنیم (بس اتنے ہی نام یاد آسکے) سب نے میرے ساتھ کام کیا۔ نہ جانے اب یہ سب لوگ کہاں اور کیسے ہوں گے۔ اللہ پاک انہیں خوش اور آباد رکھے۔ سلامت رکھے۔ آمین۔

میں اس تمام عرصے میں وہاں گائنی ڈیپارٹمنٹ کی انچارج تھی۔ جب دسوہا جانا شروع ہوا۔ تو ہم نے سوچا ہم بھی صوفی برکت سے نیاز حاصل کریں لیکن وہاں جا کر پتہ چلا کہ وہ پردہ فرما گئے ہیں اور اب ان کی منہ بولی بیٹی مریدوں سے ملتی ہیں۔

وہاں ان کے ایک مرید نے آنکھوں کا آئی کیمپ لگا رکھا تھا۔ بہت رش تھا۔ ہر طرف لوگ ہی لوگ اور کاریں ہی کاریں، ناچار آگے کا راستہ نا پا کر واپس چلے آئے۔

ایک اور ان کے بزرگ بابا چشتی ان کے گھر آتے تھے۔ بہت بوڑھے تھے۔ لیکن چہرہ پڑھ کر اپنے مخاطب کے سوالوں کے جواب دے دیتے۔ صغیرہ کی معرفت ہی جناب سید سرفراز شاہ کے بارے میں پتہ چلا وہ فیصل ٹاؤن میں ایک دن لوگوں سے ملتے تھے۔ چشتی صاحب اور صغیرہ بانو دونوں باقاعدگی سے ان محفلوں میں شریک ہوتے اور ان کے دیئے ہوئے اسم، کلام، وظیفہ جو بھی کہیں وہ پڑھتے تھے۔ شاہ صاحب کو کشف ہوتا تھا۔ بے شمار لوگ آتے اور اپنے سوالوں کے جواب حاصل کرتے۔ اُن میں ممتاز مفتی، صحافی، بیوروکریٹ، عبدالقادر حسن اور بہت سے لوگ شامل تھے۔ جب میں بیماری کے بعد آسٹریلیا سے واپس پاکستان آئی تو میں نے صغیرہ کو فون کیا۔ انہوں نے بتایا کہ اس جمعرات کو سرفراز شاہ صاحب مدینہ ٹاؤن کے فلاں گھر میں (یاد نہیں کہ وہ کس کا گھر تھا) تشریف لائیں گے۔ میں نے فون کر دیا ہے اُن سے مل لو۔ وہ بتا دیں گے کہ کیسی بیماری ہے جو اتنے علاج کے بعد بھی ٹھیک نہیں ہو رہی۔

میں اور میری بیٹی وہاں گئے۔ کافی لوگ اُن کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے ہمیں بلایا۔ میں نے مختصر الفاظ میں بتایا کہ کھانا نہیں کھا سکتی بہت علاج کروایا ہے۔ انہوں نے زیر لب کچھ پڑھا پھر ایک یا دو منٹ تک آنکھیں بند کیں۔ جب آنکھیں کھولیں تو ذرا غصے سے بولے۔ ''آپ کیا پڑھتی رہتی ہیں......؟''

میں نے کہا...... ''کچھ نہیں...... نماز، قرآن پاک کی تلاوت یا کوئی اور کتاب وغیرہ۔''

بولے...... ''نہیں اور کیا پڑھتی ہیں۔ بطور وظیفہ...... بند کر دیں اسے وہ بہت جلالی ہے۔ آپ میں اس کی قوت برداشت نہیں ہے اپنے اوپر اتنا بوجھ نہ ڈالیں۔''

تب مجھے یاد آیا کہ شہاب نامہ کے آخر میں جو ''دعائے کن فیکون'' ہے وہ پڑھتی تھی۔ میں نے بتایا کہ اس کیلئے تو کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں تھی۔ میں تو برکت کیلئے پڑھ لیا کرتی تھی۔

انہوں نے وہ دعا ''بند'' کروا دی میں نے فون کر کے صغیرہ کو بتایا وہ ہنستے ہوئے کہنے لگیں انہیں کچھ نظر آیا ہوگا جبھی تو کہہ رہے تھے بند کر دو اور اپنے ہاتھ سے کھانا پکا کر کھلایا کرو۔

اب سرفراز شاہ کی تین کتابیں۔ فقیر رنگ، فقیر نگری، کہے فقیر

چھپ کر قبول عام کی سند حاصل کر چکی ہیں اب وہ ٹی وی پر تشریف لاتے ہیں۔ جب میں نیو میڈیکل سنٹر میں تھی۔ تو صغیرہ بانو تقریباً ہر ماہ تشریف لاتیں۔ ساتھ دو تین خواتین ہوتیں۔ کھانے کے بعد گاڑی اور ڈرائیور ان کو صوفی برکت سے ملاقات کیلئے لے جاتا۔

اکثر مریضوں کو میرے پاس ریفر کرتیں۔ کسی کا لیبارٹری ٹیسٹ کی فیس دے رہی ہیں، کسی کی ادویات کیلئے۔ انہوں نے ایک پرچہ اُردو کا شائع کرنے کا ارادہ کیا تھا جس کا نام رکھا ''آبرو'' اس کیلئے ڈیکلریشن بھی حاصل کر لیا۔

جب مجھ سے بات ہوئی تو میں نے کہا کہ آپ بسم اللہ کریں شائع کروائیں اتنے لوگ آپ کے جاننے والے اور پڑھنے والے ہیں۔ انشاءاللہ ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

کہنے لگیں دراصل پیسوں کا پرابلم ہے۔ بہت سارے اخراجات تو آفاق صاحب کی بیماری پر اُٹھ جاتے ہیں۔ میں نے کہا چلو میں ابتدا کرتی ہوں۔ فرمایا کہ تم صرف لکھنے میں میری مدد کرنا میں نے اصرار کیا اور اسی وقت دس ہزار روپے ان کے حوالے کر دیئے۔ آپ حیران نہ ہوں۔ 1997ء میں یہ بہت بڑی رقم تھی اور رسالہ نکالا جا سکتا تھا۔

لیکن افسوس کہ وہ پرچہ نہ نکال سکیں۔ حالات دگر گوں ہو گئے۔ اُن کو سمن آباد والا گھر بیچ کر وہاں سے شفٹ ہونا پڑا۔ دو بچوں کی شادی ہو چکی تھی۔ چھوٹے بیٹے کی شادی میں ہم بھی شریک ہوئے تھے شازیہ ان کی بہو بہت پیاری تھی اور ان کے بیٹے کی پسند تھی۔ پھر چھوٹی بیٹی خدیجہ کا رشتہ طے پا گیا۔ آفاق صاحب کا انتقال ہو گیا۔ لیکن ان کے شب و روز جو وہ سماجی بہبود کے کام کرتی تھیں۔ اس میں فرق نہ آیا۔ بلکہ پہلے سے بھی زیادہ تندہی سے لکھنا پڑھنا اور خدمت میں مصروف ہو گئیں مجھے جب بھی فون کیا کسی مریض کے علاج کیلئے، یا یتیم لڑکی کے رشتے کیلئے یا میاں بیوی کے درمیان صلح کروانے کیلئے۔

معلوم نہیں کتنے سال گزر گئے۔ پھر وہ کہنے لگیں۔ شگفتہ! میری صحت اب اجازت نہیں دیتی کہ میں پرچہ نکال سکوں۔ تم اپنے پیسے واپس لے لو۔ میں نے کہا، جس فنڈ سے آپ دوسروں کی مدد کرتی ہیں۔ اس میں ڈال دیں سمجھیں مجھے مل گئے ہیں۔ لیکن وہ نیت کی صاف، فرمان کی سچی اور وعدے کی پکی تھیں۔ انہوں نے مجھے واپس لوٹا دیئے کہ تم خود کسی کی مدد کرنا۔ 2007ء میں آسٹریلیا آنا ہوا اب یہاں مستقل ٹھہرنے کا ارادہ تھا۔ بہت سارے دوستوں کو ملے بغیر ہی کوچ کرنا پڑا۔ لیکن جب میں 2008ء میں پاکستان گئی تو نہ جانے ان کو کیسے پتہ چلا اُن کا فون آ گیا۔ میں خوشی کے ساتھ حیران بھی تھی کہ آپ کو کیسے پتہ چلا اور میرا نمبر کہاں سے ملا۔ بہت خوش مزاج تھیں ہنستے ہوئے کہنے لگیں۔

''سلامت رہو تم پاکستان آئی ہو تو تمہاری خوشبو آ جاتی ہے۔ نمبر حاصل کرنا کیا مشکل ہے عباس صاحب ہیں۔''

ایک خاتون کے ہاں اولاد نہیں تھی وہ میرا مشورہ چاہتی تھیں۔ پھر 2014ء میں اُن کا فون آیا۔ اس دفعہ میں چھ ماہ پاکستان میں ٹھہری۔ ایک دن فون آیا۔ کہ ان کے دور پار کے عزیزوں میں ایک لڑکی ڈاکٹر ہے، والدہ سنگل پیرنٹ ہیں۔ شاید بہت پہلے علیحدگی ہو گئی تھی۔ پی ایچ ڈی ہیں۔ بس ایک ہی بیٹی ہے اپنا پیارا سا گھر ہے۔ گاڑی ہے کسی یونیورسٹی میں ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ ہیں۔ ان کی بیٹی کیلئے کوئی رشتہ بتاؤ۔

میں نے کہا۔ لو یہ کیا مشکل ہے لڑکی خوش شکل ہو۔ اکلوتی بیٹی ہو اور پھر سونے پہ سہاگہ ڈاکٹر بھی ہو...... رشتوں کی ایک لائن ہے۔ ذرا ہولڈ کریں میں ڈائری کھول کر ابھی بتاتی ہوں۔ زبانی سارا ڈیٹا یاد نہیں رہتا۔ لکھ لیتی ہوں۔ کہنے لگیں اچھا کرتی ہوں...... مجھ سے تو لکھا بھی نہیں جاتا۔ ابھی کمزوری بہت ہے۔ میں نے ایک انجینئر، ایک فوجی آفیسر، اور ایک ایم بی اے کا رشتہ فٹافٹ بتا دیا۔ بولیں...... ان کی ایک شرط بھی ہے۔ وہ کیا...... میرا تجسس بڑھ گیا۔

وہ لڑکے کو گھر داماد رکھنا چاہتی ہیں ایک بیٹی ہے وہ چلی گئی تو اکیلی رہ جائینگی اچھا تو یہ بات ہے اب میرے غور و فکر کرنے کی باری تھی۔

شگفتہ! لوگ آتے ہیں تو لڑکی کو نہیں دیکھتے گھر کی دیواروں کو ٹھوک بجا کر دیکھتے ہیں۔ الماریوں کے پٹ کھول کر کہتے ہیں گھر کافی پرانا ہے توبہ کرو کیا زمانہ آ گیا ہے جن کے سر پر مرد نہ ہو۔ تو یہ حال ہوتا ہے۔ اب کیا کہتی ہو...... وہ ہنس رہی تھیں۔ کیا کہوں میرا بیٹا ہوتا تو میں

ضرور بھیج دیتی بعد میں بھی تو بھونے لے ہی جانا ہوتا ہے بس یہ کام کر دو تو بڑی مہربانی ہوگی۔ اور ہاں حلیمہ کی شادی کو دس سال ہو گئے بچہ نہیں ہوا اب اس کا میاں دوسری شادی کر رہا ہے وہ رو رہی تھی۔ کیا کروں؟

اب میری سننے کی باری تھی۔ میں نے کہا سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے اسے کہیں رپورٹیں ای میل کر دے۔ دیکھ کے بتاؤں گی۔ اب چھوٹی بیٹی خدیجہ کی باری تھی۔ اللہ تعالیٰ نے سبب پیدا کر دیا۔ اور بہت اچھے گھرانے میں اس کی شادی ہوگئی۔ میں شریک نہ ہوسکی کیونکہ آسٹریلیا میں تھی۔ بزرگوں کی زیارت کرنا۔ ان کے حضور حاضر ہونا۔ زیارتوں پر جانا اُن کا معمول تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ شاہ صاحب نے ان کو کوئی وظیفہ پڑھنے کیلئے دے رکھا تھا۔ کہنے لگیں بیس سال سے اوپر ہوگئے جب بھی جاتی ہوں کہ کچھ اور بتائیں تو وہ کہتے ہیں ابھی پہلا وظیفہ جاری رکھو۔ میں نے پوچھا پھر کچھ روحانی بلندی کے درجات نصیب ہوئے؟ جواب ملا نہیں ہمیں تو کچھ نہیں ملا۔ لوگوں سے تو درجوں کی بلندی کے بڑے واقعات سنے ہیں۔

سوالوں کے جواب دینا کوئی اُن سے سیکھے۔ ہر طرح کے مسائل اُن کے پاس آتے ہیں وہ خط لکھنے کا دور تھا۔ بیرون ملک سے دلچسپ خط آتے تو مجھے فون پر سنایا کرتیں۔ 2012ء میں ملاقات فقط فون تک محدود رہی۔ چاہنے کے باوجود نہ مل سکی وہ بیمار تھیں، سیالکوٹ نہ آسکیں۔

2014ء میں اُن کا اصرار تھا کہ ضرور آؤ ملنے کیلئے۔ تقریباً ہر ہفتے فون کر لیتیں دو تین رشتوں کے بارے میں اور کچھ گائنی کے مشورے ہوتے ہیں میں نے ایک فون کیا تو ملازمہ نے اُٹھایا۔

میں نے پوچھا بیٹا گھر پر کوئی نہیں ہے میں نے صغیرہ شیریں سے بات کرنی ہے وہ بولی باجی ان کی طبیعت بہت خراب ہوگئی تھی سب لوگ ان کو لے کر ہسپتال چلے گئے ہیں وہ آئی سی یو میں ہیں۔

میں غم کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گئی۔ لبوں سے بے اختیار انکلا یا اللہ خیر! دو دن بعد فون کیا تو پتہ چلا کہ اب بہتر ہیں واپس آگئی ہیں لیکن آواز سے کمزوری جھلک رہی تھی۔

بڑے دُلار سے کہنے لگیں شگفتہ مل جاؤ نا آ کر...... نہ جانے کب زندگی کا چراغ گُل ہو جائے۔ میں نے کہا ایسے تو نہ کہیں انشاء اللہ اب کے لاہور آئی تو ضرور ملاقات ہوگی۔

لاہور جانا ہوا۔ قیام لاہور کے دوران جب ماڈل ٹاؤن میں بزم سخن اختتام پذیر ہوئی تو میں نے آسیہ راشد کو بتایا کہ صغیرہ بانو شیریں کو ملنے جانا ہے۔ آسیہ، فرزانہ چیمہ، گل رعنا اور شاید آپا صبیحہ نبوت بھی ہمارے ساتھ تھیں۔

گاڑی آسیہ چلا رہی تھیں بہت ہی ماہر اور صبر والی ڈرائیور ہے۔ مدتوں بعد ہم چاروں لوگ اکٹھے ہوئے تھے گھر بھی ڈھونڈ رہے تھے اور اس وقت کے ہر لمحے سے خوشیاں کشید کر رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے جملے، کوئی پھڑکتا ہوا شعر، فرزانہ کا جوابی شعر...... اِن سب نے ان کو پہلی بار ملنا تھا اور بہت شوق تھا۔ فون کر کے راستہ پوچھا کئی بار...... میرا جغرافیہ ہمیشہ سے کمزور رہا ہے تاریخ البتہ بہتر ہے۔ یہ آسیہ کی ہمت تھی کہ اس نے منزل مقصود کے سامنے جا کر بریک لگائی۔

بڑا سیاہ گیٹ، متاثر کن بنگلہ...... یہ ان کی بڑی بیٹی کا گھر تھا۔ اندر داخل ہوئے۔ وہ سامنے والے کمرے میں ہمیں ملنے آ رہی تھیں۔

اف اللہ اس قدر کمزور...... نحیف...... میں نے انہیں ہمیشہ چاق و چوبند اور مسکراتے ہوئے دیکھا تھا...... میں نے سوچا۔

زندگی میں یہ بھی لمحے منتظر تھے آپ کے
چاہنے اور پڑھنے والے کس قدر تھے آپ کے

میرے دل نے کہہ دیا کہ یہ چراغ سحری ہیں! بڑی اچھی ملاقات رہی، باتیں تاریخ، قصے، تعارف، ادب، حالات، سیاست، بے وفائی کا کلچر، کج ادائی کا شکوہ، منافقت کا فیشن، بے صلہ زندگی، محرومیوں کا گلہ اور تمنا کی نارسائی......غرضیکہ کونسا موضوع تھا جسے چار یاروں نے نہ لتاڑا ہو۔ یہ فقرے پڑھ کر میری چاروں اس دن کی ساتھی خوب قہقہے لگائیں گی۔ ایسی محفل ہو تو وقت کو پر لگ جاتے ہیں۔ مزے کی چائے اور لوازمات سے تواضع ہوئی عصر کی نماز پڑھی گئی اور ہم اجازت کے طلبگار ہوئے۔

ہر صبح کی شام...... ہر ملاقات کا انجام...... لمحوں کی خوشی سالوں کا

انعام......اب پردیس میں کہاں ہیں وہ چہرے گلفام، مسکراتے ہوئے لبوں پر مزاحیہ جملوں کا اژدھام، لیکن اب وہ یادیں ایک الزام......اور یہ دنیا......کام، کام، کام......آنے والوں کا استقبال اور جانے والوں کو سلام کیا کیا لکھوں۔ کہاں تک لکھوں...... یادوں کا اِک ہجوم ہے......

سالوں کا ساتھ تھا ایک دو دن کی بات نہیں۔ وہ نیک، ہمدرد، پرخلوص، دانشمند، دیندار، خدمت گزار، مہمانوں کی پذیرائی کرنے والی، ہروقت، ہر کسی کی خدمت کیلئے تیار...... مجھے حیرت ہوتی تھی کہ کسی کو انکار نہیں کرنا۔ ہمہ وقت کسی نہ کسی گتھی کو سلجھا رہی ہیں۔

تقویٰ کے اعلیٰ درجے پر فائز تھیں، ظاہری، بناؤ سنگھار، مہنگے لباس سے بے نیاز، سادہ خوراک، سادہ زندگی، ہمیشہ سچ کا ساتھ دینا، دل سوزی سے دوسروں کی مدد کرنا۔

اُردو ڈائجسٹ کا اور اُن کا ساتھ چالیس برس رہا۔ انٹرویو، افسانے، سوال جواب لکھتی رہیں۔ لیکن آخری ملاقات میں انہوں نے گلہ کیا کہ نہ اب وہ لوگ رہے نہ قدر دانی رہی۔ جس ادارے کی میں نے 40 سال خدمت کی انہوں نے ہمیں بھلا دیا۔ میں سوچتی رہی کہ جناب ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی صاحب انتہائی نیک متقی، بردبار اور دانشور ہیں۔ انہوں نے میرا چہرہ پڑھ لیا اور کہنے لگیں کہ وہ تو ڈائجسٹ سے الگ ہوگئے ہیں۔ انہوں نے اپنا تمام کاروبار بیٹوں میں تقسیم کر دیا ہے جو نئے نئے لوگ آ گئے ہیں وہ کیا جانیں نہ وہ روایات، نہ ادب نہ احترام، نہ عزت، نہ قدر......نئی نسل تو اپنے بزرگوں کا احترام کرنا بھی بھول گئی ہے۔

میں نے انہیں بتایا کہ یہ اُردو ڈائجسٹ تھا جس میں میرا پہلا مضمون (مزاحیہ) 1967ء میں شائع ہوا۔ اس کا عنوان تھا۔ ''شوہر کا خانہ خراب کیجئے'' دراصل اس سے پہلے شمارے میں کسی ''صاحب'' نے لکھا تھا ''بیوی کا خانہ خراب کیجئے'' میں نے پڑھا تو مجھے بڑا تاؤ آیا کہ بے چاری بیوی نے کیا بگاڑا ہے۔ ہم بھی آٹھویں کا امتحان دے کر فارغ تھے۔ ہم نے یہ مضمون لکھا اور پوسٹ کر دیا۔ امید نہ تھی کہ شائع ہوگا۔ مگر ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ نہ صرف شائع ہوا بلکہ ڈاکٹر اعجاز کے خط کے ساتھ 50 روپے کا انعامی چیک بھی وصول ہوا۔ یہ کسی تحریر پر پہلا انعام تھا۔

اب اسی اُردو ڈائجسٹ میں میری کتاب سے ماخوذ دو واقعات شائع ہوئے اور ساتھ میں کسی اور کی تصویر میرے مضمون کے اندر شائع کر دی میں نے ڈاکٹر صاحب کو خط لکھا اور اس اخلاقی جرم کی طرف توجہ دلائی لیکن جواب نہ آیا۔ چونکہ صغیرہ کا اُن سے بہت پرانا تعلق تھا میں نے اس ملاقات میں کہا کہ چلیں سمن آباد دفتر اُردو ڈائجسٹ چلتے ہیں۔

انہوں نے انکار کر دیا کہنے لگیں اب جو لوگ ہیں میں اُن سے ملنا نہیں چاہتی ادب کی خدمت کرنے کا دعویٰ کرنے والوں کو اپنی روایات کی پاسداری، بزرگوں کا احترام اور صحافتی دیانت کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔ کاش میری یہ تحریر ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی صاحب کی نظر سے گزرے اور وہ اپنی زندگی بھر کے اس اثاثے کو ڈوبنے سے بچا سکیں۔

اب اللہ ہی جانے کہ صغیرہ بانو شیریں کی دائمی جدائی پر ڈائجسٹ نے کوئی تعزیتی پیغام بھی شائع کیا ہوگا یا نہیں۔ قارئین کی نظر سے اگر گزرے تو پلیز مجھے ای میل کر کے ضرور بتائیں۔ میرا ایڈریس یہ ہے۔

drsnaqvi@yahoo.com

میری دعا ہے کہ پروردگار عالم میری دوست اور بہن کے سارے قصور معاف فرمائے۔ انہیں بخش دے اور جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ ان کے اہل خانہ اور دوستوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
وہ حقیقت میں کبھی ہم سے جُدا ہوتے نہیں

☆......☆......☆

شمیم فاطمہ

# ہر کامیابی کے پیچھے!

اِدھر کسی بچے کا رزلٹ خراب آیا۔ اُدھر ماں کو سننا پڑا کہ ’’تم کرتی کیا ہو سارا دن؟‘‘ اِدھر بچے کی زبان سے قابلِ اعتراض لفظ نکلا اُدھر ماں پکڑی گئیں کہ ’’سن رہی ہو کیا کہہ رہا ہے؟ تم تو کسی بات کا نوٹس ہی نہیں لیتی ہو‘‘...... بچے دیر سے اٹھیں تو آنکھیں اماں کو دکھائی جاتی ہیں، بچے دیر سے سوئیں تو تنبیہہ اماں کو کی جاتی ہے...... بچے بات نہ سنیں...... بچے اپنی چیزوں کو اِدھر اُدھر پھیلا دیں......کھیل کود، پڑھنے لکھنے کا کوئی وقت مقرر نہ ہو تو......سنائی اماں ہی کو جاتی ہے...... بدتمیزی ہو، بدتہذیبی ہو، بداخلاقی ہو، ضدی پن ہو...... یا اس سے دو قدم آگے کے مسائل......تربیت کا طعنہ ماں ہی کو دیا جاتا ہے...... نپولین بھی کہتا ہے کہ ’’تم مجھے اچھی مائیں دو، میں تمہیں اچھا معاشرہ دیتا ہوں‘‘......اس مقولے کی رو سے معاشرے کی بگڑی ہوئی حالت اور اخلاق کی جو درگت موجودہ معاشرے میں نظر آ رہی ہے اس کی ذمہ دار بھی ماں ہے......کیونکہ بچے کی سب سے پہلی درسگاہ ماں کی گود ہوتی ہے۔

اب ’’اچھی ماں‘‘ کارخانے میں تو تیار ہوتی نہیں ہے اسی ماحول اسی معاشرے کی پروردہ ہوتی ہے۔ اور اس معاشرے میں انسان سماجی جانور کی حیثیت سے جی رہا ہے۔ جانور کو اگر سدھایا نہ جائے تو بھی جانور ہی رہتا ہے، لیکن انسان کی اگر تربیت نہ کی جائے تو وہ جانور سے بھی بدتر ہو جاتا ہے، مضر بن جاتا ہے، ضرر رساں، دوسروں کو بھی نقصان پہنچاتا ہے اور اپنے وجود کو بھی۔ اگر کتا انسان کو کاٹے تو......(پیٹ میں 14 ٹیکے لگوا کے انسان کتوں کے خصائل سے محفوظ و مامون ہو جاتا ہے) لیکن اگر انسان انسان کو کاٹے تو...... یہ ایک جرم بن جاتا ہے، قابلِ سزا جرم! چوری، ڈکیتی، دھوکہ دہی، اغواء، زنا، قتل اور دیگر بے شمار جرائم...... (جنہیں اب معمولات کی فہرست میں درج کیا جاتا ہے) بچیوں سے زیادتی کے واقعات خبروں کا حصہ بنتے جا رہے ہیں......ان واقعات پر غم وغصہ......مظاہرے......مکالمے......لعن طعن......میڈیا پر تشہیر......اپنی جگہ......جرم ثابت ہونے پر بھی مجرم کو سزا نہ دینا قابلِ افسوس سہی...... ان واقعات کے روک تھام کے لیے کوئی قدم نہ اٹھانا قابلِ تشویش سہی...... یہ بات سوچنے کی ہے کہ معاشرے میں یہ جا بجا، نوع بہ نوع، پے در پے جرائم کیوں پھل پھول رہے ہیں؟

معاشرتی بگاڑ کتنے ہی عذر اور اسباب ہوں، ایک سبب کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور وہ ہے تربیت میں کوتاہی......! اور تربیت کی ساری ذمہ داری ماں پر ڈال دی جاتی ہے۔ مرد تو بس کان پر قلم رکھ کر نکل جاتا ہے۔ (گھر آتا ہے تو دنیا کی جنت منتظر رہتی ہے......مر جاتا ہے تو جنت میں حور منتظر رہتی ہے!) اس طرح وہ گھریلو اور معاشرتی بگاڑ میں نہ خود کو حصہ دار ٹھہراتا ہے نہ ذمہ دار......سارے بگاڑ کا سہرا غریب ماں کے سر باندھ دیا جاتا ہے۔

ایک عورت سے زمانے نے کیا کیا توقعات باندھ رکھی ہیں۔ ہر کسی کی لاج اس اکیلی جان کو رکھنی پڑتی ہے۔ سارا کام اسی کو کرنا پڑتا ہے۔ خدمت گزاری، مہمانداری، تیمارداری، پکانا، کھلانا، صفائی ستھرائی، کپڑوں کو دھونا، سکھانا، تہہ کر کے رکھنا، استری کرنا، ٹیلر کے چکر لگانا۔ کپڑوں کی خریداری کرنا......ان کی میچنگ تلاش کرنا......بجلی پانی کے بل جمع کروانا......کسی کی بیمار پُرسی کرنے جانا......دعوتوں کا اہتمام کرنا......نئی نئی ڈشیں آزمانا...... نئے کھانے کی ترکیبیں نوٹ کرنا......کپڑوں کے نئے ڈیزائن پر غور و فکر کرنا وغیرہ وغیرہ......اب اس ہجوم کار میں بچوں کی تربیت کا ذمہ بھی اسی پر ہے......اس افراتفری اور ہماہمی میں جتنا بن پڑا اتنا کر دیا، ڈانٹ ڈپٹ کر لی، گھرک دیا، دھمکا دیا، سمجھا دیا۔

ہر بگاڑ کا سہرا ماں کے سر سجانے سے پہلے ذرا اپنے کردار کا بھی اچھی طرح جائزہ لے لیجیے کہ آپ اس کے ساتھ بچوں کی تربیت میں کس

قدر معاونت کر رہے ہیں ......آپ کو گھر کا ماحول خوشگوار اور پرسکون رکھنے سے سروکار ہے کہ نہیں۔ آپ اپنے بیوی بچوں کے مسائل سمجھنے اور سلجھانے میں کوئی دلچسپی لیتے بھی ہیں یا نہیں؟ آپ کو ان کی خوشیوں، غموں سے کوئی مطلب ہے کہ نہیں۔

اگر آپ اپنی ذمہ داری احسن طریقے سے نہیں نبھا رہے۔ گھر والوں سے آپ کا رویہ اچھا نہیں ہے تو سمجھ لیجئے کہ نہ گھر میں سکون کی فضا قائم ہوگی نہ ملت کے ستاروں کی تربیت صحیح ہوگی۔ نہ دنیا سنورے گی نہ آخرت...... (دلوں کی الجھنیں بڑھتی رہیں گی، اگر کچھ مشورے باہم نہ ہوں گے......) آپ کے خوف سے آپ کے عزت واحترام، محبت اور عقیدت میں کمی واقع ہوگی......جس سے آپ کی خواہشات کو نظر انداز کیا جانے لگے گا......آپ کی مرضی کے کاموں کو پسند نہیں کیا جائے گا......آپ کے پیچھے وہ کام نمٹائے جائیں گے جو آپ کے سامنے نہیں کئے جا سکتے......اس طرح صاحبِ خانہ سے چھپا چھپا کے کام کرنے کی عادت پڑ جائے گی......اس طرح جھوٹ کو ترغیب ملے گی......اس طرح رشتوں پر سے اعتماد اٹھے گا......اس طرح من مانی کرنے کی راہ ملے گی......اس طرح مخالفت کی روش پیدا ہوگی......حقوق کی جنگ چھڑ جائے گی......ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی کا آغاز ہو جائے گا......گھر کا امن تباہ ہوگا......خاندان کی اکائی بکھرے گی......تُو تُو مَیں مَیں بڑھے گی......اس طرح گھر کی آواز باہر سنی جائے گی......اس طرح آپ کی خاندانی ساکھ بے آبرو ہوگی۔

محض یہ کہنے سے کام نہیں چلے گا کہ ''تم ماں ہو تم جانو......'' اسے ایک کامیاب ماں بنانے کے پیچھے آپ ہی کے ہاتھ کی ضرورت ہے......گھر کے امام تو آپ ہی ہیں۔ آپ ہی کے اخلاقِ حسنہ، توجہ اور تعاون سے اس معاشرے کو ایک اچھی ماں میسر آ سکتی ہے......کبھی اس کی حوصلہ افزائی کیجئے۔ کبھی اس کے کھانوں کی تعریف کر دیا کیجئے......کبھی اس سے مشورہ لے لیا کیجئے......کبھی اس کی مان لیا کیجئے......کبھی اس کو مسکرا کر دیکھ لیا کیجئے...... (آپ تو چاہتے ہیں کہ سارا بگاڑ آپ میں موجود رہتا، آپ نہ سیدھے منہ بات کریں، نہ کوئی بات سنیں، نہ کوئی بات سمجھیں......بس ایک سلطان راہی بنے رہیں، نہ تسلیم کی خُو ڈالیں......نہ بیوی بچوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنوائیں......آفس سے آ کر اخبار میں چھپ جائیں......جب بولیں تو شعلے لپکیں......جب دیکھیں تو غصے اور ناگواری کے ساتھ......اور خواہش آپ کی یہ ہو کہ آپ کا گھرانہ مثالی ہو......باکمال ہو) دنیا کے تمام باپ بلکہ ہمارے یہاں کے تمام باپ یہ چاہتے ہیں کہ ان کے بچے نمازی، پڑھاکو، ملنسار، خوش گفتار، سمجھدار، باادب، سحر خیز، مطالعے کے عادی، ہمدرد، دیندار، صلح جُو اور نیک خُو ہوں......اور یہ بھول جاتا ہے کہ بچے کے لیے رول ماڈل تو آپ ہی ہیں......آپ میں اگر خوش قسمتی سے یہ اوصافِ حمیدہ پائی جاتی ہیں تو آپ یقین رکھئے کہ آپ کے بچے ویسے ہی ہوں گے جیسا آپ چاہتے ہیں......بصورتِ دیگر......کوئی معجزہ ہی انہیں صالح بنا سکتا ہے......آپ بچے کے لیے عملی نمونہ پیش کیجئے...... (ہر چند کہ انسان اپنی آنکھوں سے دوسروں کے عیب اور خرابیاں بآسانی دیکھ سکتا ہے لیکن کبھی اپنے عیب و ہنر پر بھی نظر ڈالیے......) اپنی غلطیوں کا اعتراف کیجئے......اپنی کوتاہیوں کو تسلیم کیجئے......آپ نے اگر یہ سمجھ رکھا ہو کہ آپ کا رعب ہی آپ کو ایک کامیاب باپ بنائے گا تو اس میں ایک لچک پیدا کیجئے......ایک توازن......

حکیم لقمان کو دیکھئے وہ اپنے بیٹے کے ساتھ کتنے مخلص تھے......حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھئے وہ اپنی اولاد کے لیے کیسے دعائیں کرتے تھے......اپنے رسولؐ کو دیکھئے......بیوی بچوں کے ساتھ، افرادِ خانہ کے ساتھ کیسا مشفقانہ، محبت آمیز رویہ تھا......محبت بھی کرتے تھے، دلجوئی بھی کرتے تھے، علم بھی سکھاتے تھے، تربیت بھی کرتے تھے، (کیا مشکل تھا اگر چہیتی بیٹی کی فرمائش پر ایک غلام ساتھ کر دیتے......نہیں کیا......تسبیح فاطمہؓ کی تلقین کی......بیٹی نہ روٹھی، نہ بدگمان ہوئی) محبت ایسی کیجئے جو دلوں کو فتح کر لے۔ اس علم سے بہرہ مند ہوئیے جس سے وہ خانوادے بہرہ مند تھے......جو اللہ نے ہر مرد و عورت کے لیے فرض قرار دیدیا ہے......پھر آپ کے دل کو وہ گھاؤ نہیں لگے گا جو اولاد کے رویوں، اخلاق اور انداز سے آج کل کے والدین کو لگ رہا ہے......یہ غفلت، نفرت، ناگواری کے طرزِ عمل کو خیر باد کہیے۔ محبت، توجہ، احتیاط سے خاندان کا نظام چلائیے......اپنی بیوی کے ہاتھ کو وہ ہاتھ بنا دیجئے جو ہر کامیاب مرد کے پیچھے ہوتا ہے......! ☆......☆......☆

# طالبِ سحر

16 دسمبر کی وہ شام بھی کراچی میں دسمبر کی عمومی شاموں جیسی تھی۔ یا شاید کچھ اور پھیکی اور زردسی۔ تارکول کی سیاہ صاف ستھری سڑکوں میں سے ایک ایسی ہی سڑک پر گاڑی ہموار رفتار کے ساتھ رواں تھی۔ کراچی شہر کے ''طاقتور لوگوں'' کا علاقہ تھا۔ روڈ کے دونوں اطراف بنے اعلیٰ تعمیراتی نمونوں کی رہائش گاہیں لمحہ بھر کو میری توجہ بھرپور اپنی جانب کھینچتیں۔ لیکن ایک اداسی اور یاسیت کا سا احساس بھی ان دلکش عمارتوں کے ساتھ لپٹا نظر آتا۔ ایک سوال ایک خیال ہر تعمیر پر چسپاں لگتا۔ اتنے عمدہ رہائش گاہ سے جب انسانی روح عالم بالا رخصت ہوتی ہوگی تو کیا پلٹ کر ان سجے سجائے دیدہ زیب در و دیوار پر الوداعی نظر ڈالتی بھی ہوگی یا ایسے ہی بے نیازی سے رخصت ہو جاتی ہوگی؟ یہ وہ سوچیں تھیں جن کے حتمی جوابات آسمانی ہدایات کے ذریعے مل چکے ہیں لیکن ایک بشری سوچ نے دل کو گرفت میں لے رکھا تھا۔ قلبی کیفیات تھیں جو 16 دسمبر کے سانحہ سقوط ڈھاکہ کے ساتھ نتھی ہو کر مختلف اشکال میں ابھر رہی تھیں، محض چار دن قبل دلگیر واقعہ محترم عبدالقادر مولا کی شہادت کا تھا!

میرا دل جس نے ڈھاکہ کی علیحدگی کے غم کی گہرائی کبھی محسوس بھی نہ کی تھی، اس شہادت سے ایک ہی جست میں گویا دکھ کی اس کسک کو پا چکا تھا۔ جس نے آنکھیں نمناک بھی کیں اور تکالیف کا کچھ اعشاری حصہ پہلی بار حقیقی معنوں میں دل میں مشرقی پاکستان سے محرومی کا ابھرا۔ مشرقی بازو کو پاکستان کے ساتھ جڑا میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ اور نہ اس کی فضاؤں کی کشش نے مجھے کبھی مسحور کیا۔ مغربی ہی میں ہمیشہ میری جڑیں پیوست رہیں۔ لیکن عبدالقادر مولا کی شہادت کیا شہادت تھی جوان دلوں میں بھی محبت کی لہلہاتی فصل کھڑی کر چکی تھی جن کو مشرقی پاکستان سے بس اتنی انسیت تھی جتنی کہ بار بار سامنے آنے والے اجنبی سے۔ ہر شہید کی طرح ان سے وابستہ وائرلیس ٹیکنالوجی بھی بھرپور سرگرم ہو چکی تھی۔ دنیا سے ان کا تعلق بظاہر مادی طور پر منقطع ہونے کے باوجود شہیدوں سے خارج ہونے والی فیوض و برکات کی لہریں ان کی وائرلیس ٹیکنالوجی ہی ہوتی ہیں۔ مگر وہ روحیں جن کو شہادت کا لیبل نہیں ملتا، وہ دنیا سے رخصت ہوتے وقت اپنی زندگی کی تمام سعی اور فخر پر نگاہ ڈالنے کی فرصت پاتی ہوں گی؟

دو مختلف طرح کی ارواح دسمبر کے ڈھلتے ہوئے سورج کے ساتھ جڑی زندگی کی حقیقی تصویر بنا رہی تھیں۔ سفر جاری تھا۔ میرے شریک سفر لوگوں کی گفتگو کیا تھی، میں بالکل غیر حاضر تھی۔ انسان بھی کیا عجیب شے ہے۔ پرت در پرت کوئی دوسرا نہیں جان سکتا کہ اندرونی تہہ میں کیا ہنگامہ برپا ہے۔ قطار در قطار درخت بھاگتی گاڑی کے ساتھ محوِ سفر تھے، جیسے ان درختوں کے بارے میں کوئی نہیں جانتا یہ کن محسوسات کے عالم میں ہیں۔ ان کی سبز ڈالیاں ہوا کے جھونکوں سے ہلکورے لیتے ہوئے، فضاؤں میں محوِ پرواز پرندوں کی گاہے بہ گاہے میزبانی کرتی ہیں۔ تنے سے جڑ بیٹھے کتنے دلوں کی بے بسی اور بے کسی کے دکھ کو اپنے اندر سموتے ہوئے رب کے باغی اور سرکشوں کی جرأتیں، خوف سے ان کو لرزا دیتی ہوں گی۔ یہ سب کون جانے، کون جانے! بس رب ہی جانے بس پالن ہار ہی جانے۔ میرا بھی، درخت کا بھی، درخت کے تنے پر چلنے والے اس ملائم سے ریشمی کیڑے کا بھی، ٹہنی پر لگے اس زرد سے پتہ کا بھی جس کا ذرا سا کنارہ سوکھا سا پڑ چکا ہے۔ اور وہ رشک سے اسی ڈال کے ہرے نرم سے پتے کو دیکھتا ہے جو ٹھنڈی ہوا کے ساتھ ہلتا بے انتہا خوش لگتا ہے۔ ایسے جیسے ہم اکثر انسان اپنے مضمحل گوشوں کو دیکھتے ہوئے خوش باش لوگوں پر دن رات رشک کرتے ہیں۔ کون جانے کس پر کیا بیت رہا ہے......زمین کے اوپر بھی، زمین کے نیچے بھی!

خفیف سا جھٹکا لگا اور خیالات کی رَو یکدم بکھر گئی۔ وہ مقام آ چکا تھا

جہاں اترنا تھا۔ سورج کی آخری دھیمی کرنیں بھی رخصت ہو رہی تھیں۔ فضا میں سردی کا احساس بڑھ چکا تھا۔ اردگرد کے سبزے سے اٹھتی ٹھنڈک وجود سے لپٹ رہی تھی۔ تیز قدم بڑھاتے ہوئے بنگلے کے رہائشی حصہ کی جانب رُخ کیا۔ ٹائلز کے چمکدار فرش پر روشنیاں منعکس ہو رہی تھیں۔

مختلف حصوں میں متحرک انسانی وجود، بے آواز ملتے لب، دنیا کی خوبصورتی سے مزین در و بام...... سب ہی کچھ زندگی کے بہترین لوازمات تھے۔ آخر کیا کمی تھی منظر میں؟ سب ہی کچھ عمدہ، سب ہی کچھ اعلیٰ، بظاہر دلکش تصویر......لیکن یہ ایسا چمکدار تازہ پتہ تھا جس کا کنارہ زرد ہونا شروع ہو گیا تھا۔ یہاں کا مکین دائمی سفر کی جانب کوچ کر چکا تھا۔ اتنی عمدگی کے باوجود، اتنی آرائش کے ہوتے، اتنے وسائل رکھتے ہوئے اتنے بھرپور لمحات ہوتے کیا روح نے جاتے جاتے پلٹ کر دیکھا ہوگا؟ یا آگے کی منزل نے ان سب کو دھندلا دیا ہوگا...... پورے ماحول کی نفی کر دی ہوگی! ''دو منٹ کے پڑاؤ کی جگہ ابدی قیام گاہ کی جانب روانہ ہوتے وقت کیا اہمیت رکھ سکتی ہے بھلا'' دیوار گیر اسمائے حسنہ کی خطاطی کے دلکش نمونوں نے مجھ سے سرگوشی کی تو میں دیوار پر لرزتے ان سایوں کو دیکھنے لگی جو اردگرد کے نفوس کے بن رہے تھے۔

آخر اس دیوار پر کیوں سایے بن رہے ہیں۔ مجھے بے کلی سی ہونے لگی۔ اپنی توجہ میں نے دوبارہ ان اسماء حسنہ کی جانب پھیر دی جنہوں نے لمحہ بھر قبل مجھے مخاطب کرنا چاہا تھا، ''یا حیّ یا قیوم'' دل نے بہت تقویت محسوس کی تو جیسے وجدان نے تیزی سے ان دیکھی ہستی اور ان دیکھے مقام سے سگنلز وصول کرنے شروع کر دیئے۔

''جہاں تم موجود ہو یہ وہ جگہ ہے جہاں سے سفر پر روانہ ہونے والے مسافر کے پوروں تک کے نشانات چپہ چپہ پر موجود ہیں، آواز کی لہریں گردش میں ہیں، سانسوں کی حرارت نے جو اثرات مرتب کیے ہیں وہ متحرک ہیں۔ اس کے اختیارات کی طاقت مٹی نہیں، پر وہ نشان جو اس وجود نے کائنات پر ثبت کر دیا سب کا سب بلا کم و کاست محفوظ کر کے سیل پیک کیا جا چکا ہے۔ ان تمام اختیارات، نشانات، رجحانات اور اثرات کا ریکارڈ انمٹ کر دیا گیا ہے۔ خواہ وہ عبدالقادر مولا جیسی روح ہو۔ یا اس مکین کی یا تمہاری......نگراں حیّ قیوم ہے۔ جو الرحمٰن الرحیم بھی ہے اور بے عیب حساب داں بھی۔''

دیوار پر سایے مجھے ایک بار پھر اپنی جانب کھینچنے لگے۔ توانائی سلب سی ہونے لگی لیکن اسی لمحہ کسی نے شانے پر دھیمے سے ہاتھ رکھا ''السلام علیکم ورحمتہ اللہ'' اور میرے رب نے ڈوبتے کانپتے وجود کو سلامتی کے ساتھ ڈھانپ دیا۔ ''کوشش کرنا تمہارا کام ہے میں تمہیں کبھی تنہا نہیں چھوڑوں گا'' فضا میں صدیوں قبل کہے محمد مصطفیؐ کے الفاظ ابھر آئے۔ ''**لاتحزن ان اللہ معنا**''

☆......☆......☆

ثنا علیم

# عجب جشنِ بہاراں ہے

بہار کی آمد آمد، ہوا میں خنکی، کلیوں کی چٹک، مزیدار کھانوں کی خوشبو، رنگوں کی برسات...... کتنی حسین ہے یہ فروری کی شام...... ساتھ میں ویک اینڈ، مزہ آ گیا......

آج صبح ہی سے محلے میں چہل پہل اور رونق تھی۔ کمپاؤنڈ میں ایک سے زیادہ تقریبات نے سماں باندھ دیا تھا۔ کسی گھر میں سالگرہ کی تقریب تھی۔ انتہائی خوبصورت کیٹرنگ کے ذریعے ماحول کو دلفریب بنانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ ڈھیروں غبارے، میوزک اور کھانوں کی خوشبوؤں نے محفل میں رنگ بھرنے کا سامان کیا ہوا تھا۔ محلے کے تمام بچے شام ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ کیونکہ یہ تقریب بھی ایک ننھی چھوٹی سی گڑیا کیلئے سجائی گئی تھی...... ساتھ ہی ایک گھر میں کسی کی شادی تھی۔ جدید ماڈل کی سفید سوِک کی آمد ورفت جاری تھی۔ لگ رہا تھا کہ کسی خاص فلورل شاپ نے گاڑی کے روپ کو نکھارا تھا۔ یہ سب تو ایک طرف، مگر مجھے تو ایک ولیمہ میں جانا تھا۔ شام ہونے کا انتظار اور بچوں کی تیاری سب کچھ ساتھ ساتھ جاری تھے۔ واقعی زندگی کتنی خوبصورت ہے۔ پر رونق۔ ہم اس کو انجوائے کیوں نہیں کرتے...... گزرتے وقت کے ساتھ معاشرے میں آنے والی تبدیلیوں نے زندگی میں رنگ بھر دیئے ہیں۔ فیشن ڈیزائنرز کے تخلیق کیے ہوئے خوبصورت ملبوسات، بے شمار کھانے پینے کی چیزیں، شاپنگ مالز، نئی اور بڑی گاڑیاں، ہر موڑ پر انتہائی مہنگے فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹس، بیوٹی پارلر اور سیلون، banquet، شادی ہال، قدِ آدم سائن بورڈز اور برینڈز کی بھرمار نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا ہے۔ کہیں ڈولفن شو ہے تو کہیں لان میلے، کتنی آسودہ اور خوشحال ہے ہماری سوسائٹی......

ولیمے کے لیے ایک ساتھ گاڑیوں کا قافلہ، شہر کی ایک خوبصورت اور ہموار سڑک پر رواں دواں تھا۔ ایک فیملی کا انتظار تھا سوفٹ پاتھ کے ساتھ کچھ دیر کے لیے ٹھہر گئیں۔ تیار ہو کر یوں سڑک کنارے انتظار کرنا کوفت کا سبب تھا۔ اچانک ایک موٹر سائیکل سوار نے ہمارے قریب ایک سے زائد چکر لگائے، ہم سب چکرا گئے، تیزی سے گاڑیاں دوڑائیں اور ولیمے کے مقام تک پہنچ کر ہی دم لیا۔

دولہا والے انتہائی خوبصورت لباسوں میں آراستہ ہمارے استقبال کو کھڑے تھے رنگ ونور کا سیلاب برپا تھا۔ سب کچھ بھول بھال ہم ہال میں داخل ہوگئے۔ اچانک منظر ہی بدل گیا۔ ہال کی روشنیاں بجھ گئیں۔ تیز میوزک اور Lime Light نے شادی ہال کو سینما ہال بنا دیا۔ LCD اسکرین پر دلہن اور دولہا کی آمد نے ماحول کو گرما دیا۔ ہلکے سبز رنگ کے لباس اور میچنگ میک اپ کے ساتھ عروسی جوڑا ہاتھوں میں ہاتھ دیئے اسٹیج کی جانب رواں کسی فلم کے ہیرو ہیروئن لگ رہے تھے۔ اسکرپٹ کے ساتھ ایکشن بھی غضب کے تھے۔ زندگی کے انمول لمحات کو انجوائے کرنا تو کوئی اِن سے پوچھے!

پرانے دقیانوسی دولہا (ہاں جی! وقت کی تیز رفتاری سال دو سال پہلے کے دولہا کو بھی پرانا قرار دے دیا ہے) گیٹ پر کھڑے مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے۔ چونکہ خواتین نے آج اپنے شیر خواروں کو گود میں لینے سے انکار کر دیا تھا لہٰذا اُن کے ہاتھوں کی ڈال پر ایک ایک بچہ بھی براجمان تھا...... اب سمٹی ہوئی، نظریں جھکائے معصوم سی دلہن گزرے وقت کی کہانی معلوم ہوتی ہے...... خاندان کی بڑی بوڑھیاں منہ میں ہاتھ دبائے اپنا وقت یاد کر رہی تھیں...... نئی نویلی بیگم سے محبت کا اظہار ہاتھ تھام کر ساری دنیا کو دکھا کر، فیس بک پر کور فوٹو بنا کر نہ کیا جائے تو کیسے پتہ چلے گا کہ محبت ایسی ہوتی ہے۔

ایک گھنٹے کے لائیو شو کے بعد کھانا کیا کھلا کہ سب ہی کھل گئے۔ بھری ہوئی پلیٹیں، کولڈ ڈرنک کی چھینا جھپٹی، گھر جانے کی جلدی سب کچھ

ساتھ ساتھ جاری تھا۔ کسی نے کہا شہر کے حالات اچھے نہیں، زیادہ دیر نہ کی جائے ہال کی روشنیاں بند ہونے لگیں اور واپسی کا سفر شروع ہوا۔ رات کے اندھیرے میں تیزی سے گاڑی دوڑاتے ہوئے بڑے بڑے سائن بورڈز پر لیٹی، بیٹھی، کھڑی ہر طرح کی ماڈلز چھائی ہوئی تھیں۔ بند بیوٹی پارلرز کے در دیوار دلھناپے کی حیا سے عاری، بے باک، اسٹائلش دلہنوں کی بڑی بڑی تصاویر سے مزین تھے۔ کہیں اسٹریٹ لائٹس کے کھمبوں پر یہاں تک کہ پان والے کے بند کھوکھے پر دلہن یا ماڈل اپنے بے قیمت ہونے کا اظہار کر رہی تھیں۔ کہیں میرے شہر پر ان تصاویر کے سائے ہی تو نہیں منڈلانے لگے جو ہم یوں ڈرے سہمے واپسی کا سفر کر رہے ہیں!

اپنے کمپاؤنڈ میں داخل ہوئے تو وہ بارات جس کے جانے کی تیاری ہم دیکھ کر گئے تھے واپس آ چکی تھی۔ بھنگڑے اور ناچ رنگ اور فائرنگ کے ساتھ دلہن کی آمد سو سے زائد گھروں کو بے آرام کر چکی تھی۔ پرسکون رات درہم برہم ہو چکی تھی۔ محلے داری کے لحاظ میں سب چپ تھے۔ یوں بھی وقت کا تقاضا ہے دیکھتے رہو اور چپ رہو۔ واقعی کسی کو ٹوک کر برا بننا کتنا مشکل کام ہے!

پارکنگ سے دوسری منزل پر واقع اپنے فلیٹ تک آنے کے اس چھوٹے سے سفر نے مجھے بلند منزلوں کا مسافر بنا دیا تھا۔ میرے مجازی خدا بھی گاڑی پارک کر کے آ چکے تھے۔ آدھی رات کے چمکتے چاند کو میں نے مسکرا کر دیکھا اور آہستہ سے دروازہ بند کر لیا۔

☆......☆......☆

## کوکنگ مینیا

زینب بتول۔مکۃ المکرّمہ

میری دوست سمیّہ نے مجھ سمیت کچھ دوستوں اور ان کے اہلِ خانہ کورات کے کھانے پر مدعو کیا ہوا تھا۔سمیّہ کے چھوٹے بچے فہد اور امامہ تمام دِن ماں کی بے توجہی کا بدلہ اُتار رہے تھے اور سمیّہ کی گود میں چڑھے بیٹھے تھے۔ وہ بھی اور ہم بھی مطمئن تھے کہ وہ اپنا کام مکمل کر کے میز لگا چکی تھی اور مہمان خواتین مزے دار کھانے کھانے میں مصروف ......کہ یکسر ایک مہمان خاتون نے کھانے کی تعریف کرتے ہوئے بیک وقت دو تین ڈشز کی ترکیب پوچھنا شروع کر دی۔ سمیّہ بہت ہی منکسر المزاج ہے، اب حال یہ تھا کہ وہ میزبانی کے فرائض بھی نبھا رہی تھی، بچوں سے بھی نبرد آزما تھی اور تراکیب سے بھی۔لیکن بعض اوقات اپنی بنائی ڈشز کی ترکیبیں بتانا خاتونِ خانہ کے لئے باعثِ فخر ہوتا ہے۔گھر جا کر وہ مہمان خواتین اِن ترکیبوں کو آزماتی ہیں اور پھر ٹیلی فون پر کوکنگ کے تجربات کو زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔

ابھی گزشتہ جمعرات ہی کی تو بات ہے، درس ختم ہوتے ہی منتظمہ نے اعلان کیا کہ اگلے درس میں ون ڈش پارٹی بھی ہو گی۔ ہم پر تو گھڑوں پانی پڑ گیا۔اُف! یہ مہینے کی آخری جمعرات کیسے بھاگی چلی آتی ہے؟ ابھی چند دن قبل ہی تو گزری ہے، اور ہم اپنی جانِ ناتواں پر گزرا دُکھ کیسے بھُول سکتے ہیں۔سوچا آخر کو سب لوگ کچھ ''خاص'' بنا کر لائیں گے تو ہم سادہ چیز کیسے بنالیں۔لوگ کیا کہیں گے؟

لیں جناب اُس ''خاص'' کے چکر میں دو دن گھر والوں کو ''عام'' کھانے پر ٹرخایا اور دو دن پہلے ہی ''حلیم'' چڑھا دی۔ کہ جتنی پکے گی اُتنا ہی ذائقہ دے گی۔سُوئے اتفاق کہ وہ ''حلیم'' جو اجر کی خاطر نہیں، لوگوں سے ''داد'' وصول کرنے کے لیے بنائی گئی تھی، کھاتے ہوئے ایک محترمہ نے پوچھا۔''یہ دال بہت ہی مزے دار ہے۔کِس نے بنائی ہے؟ پلیز اِس کی ریسیپی تو بتائیں......''

یوں ہمارا یہ شوقِ کوکنگ رُسوا ہوا اور آغاز میں ہی ہم سے توبہ کروا لی۔ یوں ہی ایک روز درس کے اختتام کے ساتھ ہی خاتونِ خانہ دُعا سے بھی پہلے عجلت میں سُفرۃ (دسترخوان) بچھانے لگیں۔ہم نے آہستگی سے پوچھا کہ جلدی کیا ہے؟ بولیں، جو لوگ اتنی محنت سے کوکنگ کر کے ڈِشیں لائے ہیں، کسی کے میاں لینے آگئے تو کِس قدر شرم کی بات ہوگی۔

مدرسہ بہن سے ٹرائفل کی ترکیب پوچھی گئی۔ غالباً درس کے اثرات صرف اُنہی پر باقی تھے۔انکسار سے بولیں ''میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا بس پھلوں پر جیلی ڈال کر کاپی میں نوٹ کر لیا۔ جتنا جانتی تھی آپ کو بھی یاد دہانی کرا دی۔ میں کوئی ماہر تو ہوں نہیں......'' بہن تعریف کر رہی تھی یا داد وصول کر رہی تھی، اور دوسری کی تخلیق کردہ ڈش کی ترکیب حفظ کر رہی تھی اور میں سوچ رہی تھی کہ ہم زندہ رہنے کے لیے نہیں کھاتے بلکہ شاید زندہ ہی کھانے کے لیے ہیں!

☆......☆......☆

## کہیں سے سورج نکلے

بشریٰ فیصل۔کراچی

جبر کی اک زنجیر ہے جس میں
ساری امت جکڑی گئی ہے
ہاتھ سلامت لیکن شل ہیں
آنکھیں کھلی، بینائی گم ہے
پیروں میں ہے طوق غلامی

ذہن و دل خوابیدہ گہرے
ظلم و ستم سب دیکھیں لیکن
ہونٹوں پر ہیں چپ کے پہرے
بہنوں کی چیخیں سن کر بھی
مدد سے انکی قاصر ٹھہرے
جواں میری اُمت کے سارے
زندہ ہو کر مردہ ٹھہرے
کوئی تو اٹھے طارق، جعفر
کوئی تو ابنِ قاسم ٹھہرے
کہیں سے سورج نکلے آخر
کہیں تو ظلم کی رات بھی ٹھہرے

☆......☆......☆

## بے حسی

منزہ طارق۔گوجرہ

غزہ کے الشفاء ہسپتال میں زخمی عورتوں اور بچوں کی چیخیں اور کٹے پھٹے بدن دیکھ کر ناروے کے ڈاکٹر میڈز گلبرٹ نے (جس کو ناروے سمیت دنیا بھر کے لوگ ہیرو سمجھتے ہیں) امریکی صدر باراک اوباما کو خط لکھا۔"مسٹر اوباما کیا آپ کا دل ہے؟ میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ ایک رات، صرف ایک رات غزہ کے الشفاء ہسپتال میں ہمارے ساتھ گزاریں، مجھے سو فیصد یقین ہے کہ اس سے تاریخ بدل جائے گی۔"

سوات میں ملالہ یوسفزئی کے ایک مبینہ حملے میں معمولی زخمی ہونے پر پوری دنیا میں ہنگامہ اور شور کرنے والے امریکہ و یورپ غزہ میں اسرائیلی بمباری میں سینکڑوں لڑکیوں اور بچوں کی شہادت پر چپ سادھے بیٹھے ہیں۔ ملالہ کو نوبل انعام دینے پر رضامند یہ ملک زخموں سے چور، بھوک پیاس سے تڑپتے بچوں کو دوا اور پانی دینے پر بھی تیار نہیں۔ اسرائیلی حملوں کو یہ "دفاع کا حق" قرار دے رہے ہیں۔ کوئی پوچھے کہ اسکولوں، ہسپتالوں اور آبادیوں پر حملے دفاع کا کون سا حق ہے؟

مگر پوچھے کون؟ مسلم حکمران بے حسی، بے غیرتی کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں۔ بلکہ امریکی اخبار کے مطابق اسرائیل کی اس وحشیانہ کارروائی کو عرب ممالک کی حمایت حاصل ہے دنیا بھر کے مسلمان حیران و ششدر ہیں کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایسا ہو سکتا ہے مگر ایسا ہے نیویارک ٹائمز نے یہ خوفناک انکشاف کر کے مسلمانوں کو دہلا کر رکھ دیا ہے کہ عرب لیڈر حماس کو اسرائیل سے بڑا خطرہ سمجھتے ہیں اور غزہ پر حملوں کا منصوبہ بعض اہم عرب ملکوں کے ساتھ مل کر تیار کیا گیا تھا؟

مگر ایسے میں جب تمام مرد مسلم حکمران اپنی آنکھیں اور کان بند کئے بیٹھے ہیں ایک مسلمان خاتون نے جرأت و ہمت اور اخلاقی بلندی کا اظہار کرتے ہوئے برطانیہ جیسی بڑی طاقت کی وزارت سے استعفیٰ دیدیا اور تمام مسلمان بادشاہوں اور وزراء کے منہ پر طمانچہ رسید کیا ہے۔ ویل ڈن سعیدہ وارثی! شاید کسی مسلم حکمران کی آنکھ کھل جائے، سعیدہ کے پاس تو صرف ایک وزارت تھی، کیا اسلامی ملک تیل کی قوت کو ہتھیار کے طور پر روک کر امریکہ اور یورپ کی معیشت کو نہیں للکار سکتے ؟

ایک عورت نے مسلم امہ کو اخلاقی جرأت کا سبق دیا اور اپنے حصے کی شمع جلا کر پیغام دیا کہ راستے کے اندھیرے کچھ کرنے سے دور کرنے ہوں گے، خالی حالات کے شکوے یا دعاؤں سے نہیں۔

☆......☆......☆

# علم یا معلومات

انسان اور دیگر مخلوقات میں بنیادی امتیازات میں نمایاں امتیاز قوت افکار ہے۔فکراور سوچ ہی عمل کا پہلا زینہ ہے۔اپنے حالات کو بہتر کرنے کیلئے بہتر زندگی گزارنے کیلئے وہ سوچ اور فکر ہی سے کام لیتا ہے۔ پر قوت گویائی ایک ایسا وصف ہے جو اس کے شرف کو مزید بڑھاتا ہے۔علم کا حصول انسان کی شان ہے۔اور اسی شان کی بدولت وہ معاشرے میں بھی دوسروں سے ممتاز مقام حاصل کرتا ہے۔مقام فکر یہ ہے کہ علم کی نوعیت کون سی ہے جو انسان کو شرف انسانی کے اعلیٰ مقام تک پہنچا سکتی ہے۔آج دنیا میں علم کی ایسی جہتیں ہیں ایسے شعبے ہیں ایسے کمالات ہیں کہ خود انسانی عقل اپنے کارناموں پر تعجب کرتی ہے اور فخر کرتی ہے کہ واہ! کیا علوم کے خزانے ہیں جو ہر روز اک نئے رُخ سے دنیا دیکھ رہی ہے اور فرد ہو یا قوم علم کے میدان میں برسر پیکار ہے ہر شعبے میں ''سپیشلائزیشن'' ایک معیار بن گیا ہے۔وہ زندگی کا کوئی بھی میدان ہو ایک خاص علم اور ڈگری کا محتاج ہے اور اس کے بغیر کوئی اپنے آپ کو ''تعلیم یافتہ'' نہیں کہلا سکتا۔اس کے علاوہ اپنی خاص صلاحیتوں کے سرٹیفکیٹ کی اس کو ہر قدم پر ضرورت پڑتی ہے۔

وہ مزدور کسی بھی خطہ میں ہو اس کا یہی مقدر ہے اور یہی اس کا روزانہ کا مفاد ہے۔

ہیں تلخ بہت بندہ مزدور کے اوقات

تلخ اوقات تو ہر مزدور کے ہیں۔ہر انسان ہی مزدور ہے۔کوئی کرسی پر بیٹھ کر مزدوری کرتا ہے اور اس نے کندھوں پر ڈگریوں کے اوزار سجا رکھے ہیں اور کسی نے کندھوں پر کدال رکھی ہے۔سب اپنے اپنے مفاد کے لیے محنت مشقت میں مصروف ہیں۔کوئی جسمانی مشقت میں مبتلا ہے کوئی ذہنی مشقت میں کوئی کسی کا نہ نوکر ہے نہ غلام۔نہ کسی کا خدمت گار نہ فرمان بردار سب اپنے ''پیٹ'' کے نوکر اور غلام ہیں۔سب اپنے خود خدمت گار اور اپنے نفس کے فرمانبردار ہیں۔سارا دن دوسروں کی خدمت کر کے جان کھپانے والے نوکر اور خدمت گار کسی امیر انسان اور صاحب حیثیت و اقتدار کے خدمت گار نہیں ہوتے یہ محض پیسے والوں کی انا کی تسکین ہے کہ ہمارے اتنے نوکر ہیں وہ سب خدمتیں نوکروں کی اپنے پیٹ اور اپنی ضروریات کی خاطر ہوتی ہیں۔اپنے مفاد کی خاطر ہوتی ہیں۔جب ہر امیر غریب اپنے ہی پیٹ کا خدمت گار نوکر اور غلام ہے تو پھر انسانوں میں عزت اور توقیر کے پیمانے الگ الگ کیوں ہیں؟ دنیا علم کے بیش بہا خزانوں کے منہ کھول کر بھی اس نکتہ کو نہ پا سکی۔

ڈگریاں اور محقق اگر اس نکتہ کو نہ پا سکے تو یہ علم کی بہتات تو نہ ہوئی۔ اس سارے کرہ میں علم کی نہیں معلومات کے جنگل کی بہتات ہو رہی ہے جس میں عقل و خرد گم کردہ راہ ہوتی جا رہی ہے۔علوم کے خزانوں کے منہ کھل رہے ہیں۔مگر یہ خزانے انسان کی بنیادی فکر اور سوچ کو پس پردہ لے جا رہے ہیں۔معلومات کی فراوانی ہے جو اس مشینی دور میں ہر لحظہ بڑھتی جا رہی ہے۔ایک سیلاب بلا ہے جو ہر انسان کی سوچ کو بہا کر لے جا رہا ہے وہ سوچ اور فکر جس کے لئے ڈگریوں اور تحقیقات کی ضرورت نہیں ہے۔

ایک گھر میں باغبان کی ضرورت تھی۔صاحب خانہ نے ایک نوکری کے امیدوار باغبان سے پوچھا۔بھئی کیا تم کچھ پڑھے لکھے بھی ہو؟

اس نے متانت سے جواب دیا۔پڑھنا لکھنا تو الف، بے بھی نہیں آتا بس زیر، زبر پیش کا پتہ ہے۔

مالکِ مکان نے ایسی نظروں سے اُسے دیکھا جس میں استہزاء کا رنگ نمایاں تھا۔بتاؤ زیر زبر و پیش کیا ہے؟ امیدوار نے اسی سادگی سے بات جاری رکھی۔جی میں تو یہی جانتا ہوں کہ ''میری ذات زیر ہے۔اللہ کی ذات زبر ہے اور میں نے اس اللہ کی ذات کے سامنے پیش ہونا ہے۔''

☆......☆......☆

# محشرِ خیال

## شمیم فاطمہ۔کراچی

وعدہ کرنا اتنا مشکل نہیں ہوا کرتا ہے۔شاید اسی لیے لوگ کہتے ہیں کہ وعدہ نہ وفا کرتے وعدہ تو کیا ہوتا! اور منیؔر نے یوں اعتراف کیا کہ:

جانتے تھے دونوں ہم اس کو نبھا سکتے نہیں
اُس نے وعدہ کرلیا ہم نے بھی وعدہ کرلیا

ہم نے بھی آپ سے محشرِ خیال میں حاضری کا وعدہ کرلیا اور اب ......دماغ میں ایسا ٹریفک جام ہے کہ گاڑی کو رواں دواں ہونے کا راستہ نہیں مل رہا۔(ثبوت کے لیے یہی دیکھ لیجئے کہ خط بھی ایک لائن چھوڑ کر لکھ رہے ہیں) شور شرابے، طعنہ زنی، دشنام طرازی کا زمانہ ہے۔ مسائل میں بڑھوتی ہے۔ نئے نئے مسائل جنم لے رہے ہیں، پرانے مسائل جوں کے توں ہیں......حالات کی بہتری کیلئے دعا گو ہیں کہ ملکِ عزیز میں امن وامان قائم ہو۔

اکتوبر کے شمارے میں کرامت صاحب کی غزل عمدہ تھی، نجمہ یاسمین کی نظم انشاء جی کی یاد دلا گئی، روبینہ فرید اچھی شاعرہ ہیں۔قانتہ کے نام کی طرح ان کی تحریر بھی منفرد ہوتی ہے۔طائر لاہوتی بھی ہلکی پھلکی کہانی ہے جو سوچ کو نیا زاویہ دیتی ہے...... عالیہ کا فیصلہ اچھا تھا، اگرچہ غربت دولت کی تلاش میں رہتی ہے اور ہر قیمت پر بس پیسہ چاہیے ہوتا ہے مگر رزقِ حلال کو ترجیح دینا بُری بات ہے۔قانتہ کا سفر سعادت بھی بڑا دلچسپ اور بہترین تھا۔اپنی والدہ کے لیے جو دلگداز تحریر تھی اس نے تو قانتہ کی قدرو قیمت اور بڑھا دی۔کیا عظیم ماں تھیں قانتہ کی امی! رشک آتا ہے قانتہ کے نصیب پر......یقیناً ماں سے بہت کچھ ان کے اندر بھی آیا ہوگا۔

افشاں جی کا تضاد، ہمارے رویوں کا آئینہ دار! یہ تضاد اس کثرت سے ہمارے اردگرد موجود ہے کہ گھبراہٹ ہوتی ہے۔افشاں جی جدھر سے گزرتی ہیں ان کی نگاہ کہانی دیکھ لیتی ہے۔حسنِ سیرت اور حسنِ صورت کے ساتھ ساتھ اللہ نے اپنی حسنِ بیاں اور حسنِ تحریر سے بھی نوازا ہے۔

ڈاکٹر صاحبہ کے بیگ نے جس طرح سفر کیا وہ دلچسپ تھا۔اس طرح کے مسئلے اکثر باہر رہنے والوں کے ساتھ پیش آتے ہیں۔لوگوں کو انکار بھی نہیں کیا جاسکتا اور امانت کی حفاظت بھی مسئلہ بن جاتی ہے۔فرحی نعیم نے تہی داماں کے عنوان سے معاشرے میں اولاد کے طرزِ عمل کو بخوبی قلمبند کیا۔ام ایمان کی کہانی ''نحوست'' خواتین کو چوکنا کرتی تحریر تھی۔ نزہت ظفر کی سرگزشت ایک ایسے باپ کو آئینہ دکھاتی ہے جو جیتے جی اپنے بچوں کو دورِ یتیمی دے دیتے ہیں اور اس بات پر نہ ملال، نہ ندامت!

صحت، سلامتی اور خوشیوں کیلئے دعا گو

☆......☆......☆

## عافیہ رحمت۔کراچی

ستمبر کا رنگ برنگا شمارہ آنکھوں کو اچھا لگا۔اِس وقت انتہائی مصروفیت کے لمحات ہیں۔مختصراً تبصرہ ضرور کروں گی۔ کیونکہ میری دوست، میری سہیلی نصرت یوسف کی کہانی آب وتاب سے جلوہ افروز ہے۔ بہت خوب لکھا ہے۔نصرت مجھے تمہارے تشبیہ اور استعارے بہت اچھے لگتے ہیں۔ ویسے واقعی مجھے اِس بات سے سو فیصد اتفاق بھی ہے کہ''شکر انسان کو بڑا ہی میٹھا رکھتا ہے، مطمئن رکھتا ہے۔کچھ فکر آتا بھی ہے تو ٹکنے نہیں پاتا اور رب پر بھروسہ اس کو طاقت بخشتا ہے۔''

در دِلا دوا کا اچھا آغاز ہے۔دیکھتے ہیں آگے کیا ہوتا ہے۔شمیم فاطمہ کی نظمیں خوب جا رہی ہیں ویسے مجھے شمیم کا طنز ومزاح بہت پسند آتا ہے۔ کافی کاٹ دار قلم ہوگیا ہے۔ایک بات تو بتائیں ''نورالھدیٰ'' نام کیا صرف لڑکوں کیلئے ہے؟ قانتہ جی کا تجربہ اچھا تاثر قائم کرتی، پرانا تاثر جماتی، دل کو چھوتی تحریر تھی۔ویسے آپس کی بات ہے مہنگائی کی وجہ سے اب ایسے تجربے خال خال ہی ہوتے ہیں۔افشاں باجی نے ہمیں تسبیحِ

فاطمہ کی یاد دہانی اس پیارے انداز سے کرائی ہے کہ اب ہم کبھی نہ بھولیں گے۔ ہردن نیادن بھی اچھی تحریر تھی۔

''بے معنی تفکرات سے بچیئے'' بہت مختصر اور جامع تحریر تھی۔

الغرض بتول نے چھانٹ چھانٹ کے ہمارے لئے روحانی غذا کا اہتمام کیا ہے۔تمام ہی لکھنے والے قابل تعریف ہیں۔اللہ کرے جلد ہی ہم بھی اس چمن بتول میں غنچہ وگل کھلانے والوں میں شامل ہوجائیں۔

☆......☆......☆

## شازیہ محمود۔گوجرہ

ماہِ اکتوبر کا بتول مِلا سب سے پہلے فہرست پڑھی کس کس رائٹر کی تحریریں بتول کی زینت بنی ہیں۔قانتہ رابعہ نام سرورق پر ڈاکٹر شگفتہ نقوی،شمیم فاطمہ اور افشاں نوید کے ساتھ چمکتا ہوانظر آیا تسلی ہوگئی کہ اُن کی ایک کی بجائے دوتحریریں تھیں۔قانتہ رابعہ کی مختلف جگہوں پر درس قرآن اور گھریلو مصروفیات کے ساتھ مسلسل لکھنے کی تخلیقی صلاحیتوں کی میں بڑی معترف ہوں اور رشک کرتی ہوں اُن کی تحریر ڈاکٹر شگفتہ نقوی کے ''عروسِ نو'' کا خوبصورت خلاصہ ہے جو ہرنوجوان لڑکی کو جودلہن بننے والی ہوضرور پڑھادینا چاہیے۔

اے طائر لاہوتی قانتہ رابعہ کی کہانی ہمارے نام نہاد اسلامی معاشرے میں عورت کے عدم تحفظ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

ڈاکٹر شگفتہ کا ''بیگ کا سفر'' پڑھ کر لگا واقعی بیرون ملک سے آنے جانے والوں کی کہانی ایک سی ہے۔ یہاں کے ڈیپارٹمنٹل اسٹور جس سے سامان بھرے ہیں وہی ہم مشقت سے لاتے ہیں۔''سعی کیجیے'' شمیم فاطمہ نے بہت خوبصورتی سے ابراہیمؑ ،اسماعیلؑ اور حضرت حاجرہؓ کا اپنے خدا پر پختہ یقین اور اُس کی رضا حاصل کرنے کیلئے ہر قربانی کیلئے سرِتسلیم خم کردینے کا جذبہ بیان کیا ہے۔اللہ تو ہی اپنے بندوں کو اس قدر صبر اور شکر کی توفیق دیتا ہے ہم خواتین کو بھی تھوڑا سا صبر وشکر عطا کر دے۔دعا ہے بتول کو ایسی خوبصورت تحریریں ملتی رہیں (آمین)۔

☆......☆......☆